

ملع ہا ملکہ

چھپک چھپک پتھر کے عمارتوں

UrduPhoto.com

صبح کا ذب کا وقت تھا مشرق کی سمت آسمان
پر سُرخی نے ابھی پھیلنا شروع ہی کیا تھا۔ چٹریوں کی۔

چھپا ہٹ سے فضا بھری ہوتی تھی، لان میں ابھی تک
رات کی رانی کی مہک موجود تھی انہوں نے جاگزی کے تنھے

ناولٹ،

بچے بھی ناشتے سے فارغ ہو کر کالج اور یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہوئے۔ وہ اور سچ جو س لیتے، اخبار بینی کرتے پھر ناشتے سے فارغ ہو کر اپنی اسٹڈی میں جا بیٹھتے، برسوں سے یہی ان کے معمولات تھے۔ پانچ برس ہو چکے تھے انہیں ریٹائرمنٹ لینے۔

”احسن صاحب۔ احسن صاحب۔“ انہیں محسوس ہوا کوئی کافی فاصلے سے انہیں پکار رہا تھا۔ رُک کر پانیتے ہوئے انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

باندھے اور گیٹ کھول کر باہر سڑک پر نکل آئے۔ دوستان پڑی تھی، دور ایک دودھ والا اپنی موٹر سائیکل پر جانا نظر آرہا تھا۔ انہوں نے شمال کی سمت منہ کر کے دوڑنا شروع کر دیا۔

ریٹائرڈ ایس پی احسن جیلانی کی صبح کا آغاز اسی طرح سے ہوا کرتا تھا۔ منہ اندھیرے اٹھ کر جاگنگ کے لیے نکلنا اور قریبی پارک میں ایکسرسائز کر کے آٹھ بجے واپس لوٹنا۔ واپسی پر درجہ ان کی منتظر ہوا کرتی تھیں

وہ ایک پچاس پچیس برس کا غریب سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بکھرے بالوں اور کچھڑی وار ڈھکی کے ساتھ وہ بڑا پریشان حال لگ رہا تھا۔ مشکل گھسٹا وہ ان تک پہنچا۔

”جی فرمائیے؟“ انہوں نے شائستگی سے پوچھا۔

”احسن صاحب! میری مدد کیجیے۔ خدا را میری مدد کیجیے“ اس نے ہاتھ ملے۔

”آپ کون ہیں قیلہ۔ کیا بات ہے؟“ انہوں نے قدر نرمی سے پوچھا۔

”ہیں۔ میں جی۔ میرا نام حاکم ہے۔“ اس نے تھوک لگلا۔ ”میں چوہدری عنایت علی کامالی ہوں۔“ واضح طور پر وہ ان سے بات کرتے ہوئے بے حد نروس معلوم ہو رہا تھا۔

”جی۔ میں واقف ہوں ان سے۔ آپ اطمینان بات کریں۔ بلکہ پارک قریب ہی ہے وہاں تک چلتے ہیں۔“

وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ لگتا تھا اس کے جسم کی ساری قوت و توانائی ختم ہو چکی ہے، وہ مشکل گھسٹ رہا تھا۔

”احسن صاحب۔ میں روز صبح آپ کو اس سڑک پر دیکھتا ہوں، مجھے معلوم ہے آپ پولیس میں بڑے افسر رہ چکے ہیں۔ خدا کے بعد اب میری واحد امید آپ ہیں آپ۔ آپ۔ وعدہ کریں میری مدد کریں گے۔“

دفعۃً وہ سڑک پر بیٹھ گیا اور ان کے قدموں لپٹ کر دھار مارنے لگا۔

”میری ایک بیٹی ہے احسن صاحب۔ اس کے ساتھ کچھ بڑا ہوا تو میں مر جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا جی۔“

”آپ۔ اُچھے تو سہی۔“ انہوں نے پریشانی سے جھک کر اس کے بازو تھامے۔ ”دیکھیے مجھ سے جو سن پڑا میں کروں گا۔ لیکن آپ اس طرح مت کیجیے۔ چلیے کہیں بیٹھ کر آرام سے اطمینان سے بات کریں۔“ وہ اسے لے کر پارک تک چلے آئے۔

”جی۔ یہاں بیٹھیے اور اب بتائیے کیا مسئلہ ہے؟“ انہوں نے حاکم کو بیٹھایا اور خود اس کے سامنے بیٹھ

گئے۔

”صاحب! میں غریب آدمی ہوں، اس نے کارڈ پر پڑے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔“

”حاکم نام ہے میرا اور چوہدری عنایت علی کامالی ہوں۔ یہ دو سڑک چھوڑ کر ان کی کوٹھی ہے۔“

یہ باتیں وہ پہلے بھی بتا چکا تھا لیکن وہ اسے ٹوکے بغیر خاموشی سے سنتے رہے۔

”ایک ہی بیٹی ہے میری نسیم نام کی۔ ماں اس کی پیدائش پر ہی مر گئی تھی۔ صاحب، غریب آدمی کھانا مشکل سے ہے، علاج معالجہ کے بے کہاں سے پیسہ لائے۔ توجہ نسیم کو میں نے باپ اور ماں دونوں ہی بن کر دیا ہے لیکن میری سچی۔“ وہ بھروسے لگا۔ ”بچانے کس حال میں ہوگی وہ۔“

”کہاں ہے وہ؟“ انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

”نامعلوم صاحب۔ کہاں ہے وہ۔ لیکن مجھے یقین ہے، اللہ کی قسم مجھے یقین ہے اسے چھوٹے بابو اور ان کے دوستوں نے ہی اٹھایا ہے۔ خدا ان بر بختوں پر اپنا خدا نازل کرے۔“

چھوٹے بابو کون ہیں؟

”چوہدری صاحب کے سرب سے چھوٹے بیٹے عارف صاحب! انہیں کی بڑی نگاہ تھی میری بیٹی پر۔“

”دیکھیے۔ اگر آپ اس طرح بے ربط باتیں کریں گے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آئے گا۔“ وہ بے بسی سے بولے مجھے اتنا بے بتائیے۔“

”بس جی بڑھ چکے لوگ تو ہم ہیں نہیں بجاہل! ان پڑھ تو اپنے جیسی ہی بات کرتا ہے۔ اور بات تو صرف یہ ہے جی کہ میں اور نسیم چوہدری صاحب کے بنگلے کے چھبے بے سرونٹ کو ادھر میں رہتے تھے۔ میں وہاں مالی کا کام کرتا تھا۔ وہ بھی اندر بنگلے میں بیگم صاحب کے چھوٹے موٹے کام بیٹا دیا کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کسی بار کہا جی، کہ وہ بنگلے میں نہیں جانا چاہتی۔ اسے اچھا نہیں لگتا۔ اور میں جاہل گنوار سمجھ ہی نہ سکا وہ غریب کیوں ایسا کہتی ہے، میں تو یہی سمجھتا رہا جی کہ سستی کی ماری ہے، کاہل ہے کام کرنا بڑا لگے ہے اسے۔ لیکن میں نے تو سوچا ہی نہیں کہ اپنا سارا کام جو سچی اتنی پھرتی ہے، اتنے سلیقے سے

کرتی ہے وہ دوسرے کام سے کیوں جی چھڑائے گی، میں
بھی مجبور کر کے اسے بھیجتا تھا جی تاکہ چوہدری لوگوں کو
کوئی شکایت نہ ہو جائے۔ ہم سے۔ کوئی اور درجہ کا ناہی
تو نہیں تھا نا جی۔ پھر جب میں نے ایک دن خود چھوٹے بالو
کو اس کے منہ لگتے دیکھا، تب معلوم ہوا مجھے کہ نسیم کیوں
اندر جانے سے گھبراتی ہے۔

وہ دم بھر کو سانس لینے کے لیے رکا۔

”ہوں۔“ احسن نے ہنکارا بھرا۔ ”پھر۔ کیا ہوا؟“

”بس جی۔ پھر میں نے پانڈی لگا دی اس پر۔ بڑے

صاحب سے معذرت کر لی۔ کہ نسیم کی طبیعت ٹھیک نہیں

رہتی۔ وہ گھر کا کام ہی مشکل سے کرتی ہے۔ اندر کا کام

نہیں کر سکے گی۔ بڑے صاحب تو مان گئے پر چھوٹے بالو

کا منہ بگڑ گیا۔ وہ خفا ہونے لگے۔ پھر جی۔ کوئی ہفتہ گھر

پہلے انہوں نے مجھے اپنے کام سے گاؤں بھیج دیا۔ دو دن

رکنا تھا وہاں۔ میں نے جی بڑے صاحب سے بہت بھائی

کیے لیکن انہوں نے مجبور کر کے بھیج دیا۔ مجھے پہلے ہی شک

تھا جی۔ لیکن کیا کرنا، غریب آدمی تو بڑا مجبور ہوتا ہے جی۔

بڑا مجبور۔ اور جب میں گاؤں سے لوٹا تو نسیم نہیں تھی۔

وہ کہیں بھی نہیں تھی۔“

وہ چھوٹ چھوٹ کر دو دیا۔

”میں نے بڑا ڈھونڈا ہے۔ ہر جگہ تلاش کیا۔ لیکن

اسے تو لگتا ہے جیسے زمین نکل گئی ہو۔ میں نے شور مچایا۔

فریاد کی تو اس کا صلہ یہ ملا کہ مجھے دھتکے مار کر کوٹھی سے

نکال دیا گیا۔ چھوٹے بالو پر جھوٹا الزام لگانے کے جرم

کی سزا کے طور پر مسٹنڈے نوکروں سے میری مار لگوائی

گئی جی۔“

وہ پھر رونے لگا۔

وہ تاسف بھری نظروں سے اس بوڑھے باپ کے

چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”آپ بڑے آدمی ہیں احسن صاحب۔“ آکسو یونچہ کہ

وہ ایک بار پھر گلوگیر آواز میں بولنے لگا۔ ”پولیس میں

بڑا نام ہے آپ کا جی۔ اگر آپ میری مدد کریں تو میں غریب

آدمی تو آپ کو کچھ نہ دے سکوں گا، ہاں۔ وہ خدا ضرور

مہربان ہو گا آپ پر۔ ساری عمر میں اور میری بچی آپ

کو دعا میں دیں گے۔ خدا آپ کو دونوں جہان میں سرخرو

کرے گا۔“

وہ ساکت۔ بیٹھے تھے۔

دنیا آپ کی، کامیابیاں آپ کی، عدالتیں آپ کی،

انصاف آپ کا۔ سہارا تو بس خدا رہ جاتا ہے۔ اور درحقیقت

وہی اصل سہارا ہے۔“

ان کے کانوں میں گزرتے ہوئے وقت کا کوئی۔

بے درد لمحہ چلا یا تھا۔ وہ ظالم باپ، وہ قاتل الفاظ کیسے

محسوس کئے تھے وہ۔

”حسن صاحب۔“ حاکم ان کی خاموشی سے خوفزدہ

ہو گیا۔ ”آپ۔ آپ۔ میری مدد کریں گے نا؟“

انہوں نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ بڑی خاموش۔

بے حد بھیجی ہوئی نگاہ۔

”ہاں۔“ پھر وہ بولے ”اگر تمہاری بچی اس دنیا میں

کہیں سے۔ تو میرا تم سے وعدہ ہے میں اسے ضرور

تم تک پہنچا دوں گا۔“

”احسن صاحب۔“ وہ بچے بیٹھ کر ان کے قدموں سے

لیٹ گیا۔ ”میں زندگی بھر پاؤں چھو کر پیوں گا آپ

کے۔“

”اب سے من کرو۔“ انہوں نے رسالت سے اسے علیحدہ

کیا۔ ”میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا گا۔ میرے اپنے

سر پر اتنے قرض ہیں کہ ان کے بوجھ سے میرا سانس لینا

دو بھر ہے۔ میں تو بس کسی بھی طرح، حقوڑا سا بوجھ ہلکا کرنا

چاہتا ہوں۔“

شوکت تھانوی کی مزاحیہ اور دلچسپ کتابیں

خود پڑھیں، دوستوں کو تحفے میں دیجیے

- | | |
|--------------------|--------------|
| • منکر اسٹیں | • خطبی |
| • پیلی بیگم | • خواہ مخواہ |
| • چنگی | • مکرار شاہ |
| • الماحول والا آدہ | • بہر و پیا |
| • ہم زلف | |

نوٹ: 100/- روپے سے زائد کے آرڈر پر 20 فیصد رعایت
50/- روپے سے کم رعایت کے آرڈر کا وہی پی نہیں بھجوا یا جاتا

شفیع برادرز

پوسٹ بکس نمبر 586 کراچی 74200

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، لان کی سمت کھٹنے والی کھڑکی سے ہلکی سی روشنی اندر آکر فرش پر ایک خاص مقام تک بچھی ہوئی تھی۔ باقی سہ جگہ اندھیرے کا راز تھا۔ راکنگ چیر پر آگے پھیرے ہوئے ان کا داغ ماضی کی انتہا، اندھیرے غار میں ایک خاص جگہ معلق تھا۔

”دنیا آپ کی، کامبیاں آپ کی، عدالتیں آپ کی، انصاف آپ کا، ہمارا تو بس خدارہ جاتا ہے اور درحقیقت وہی اصل سہارا ہے۔“

راکنگ چیر کی حرکت تھم گئی اور احسن جلیانی نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ سوتھے پر ان کے ہاتھ کی گرفت اتنی سخت ہو گئی کہ انہیں لگا، اب وہ کبھی ہاتھ کھول نہیں پائیں گے وہ ہارٹ پینٹ نہیں تھے، لیکن کبھی بھی ان کا دل ان کا سینہ توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا تھا۔ انہیں بے پناہ درد کا احساس ہوتا تھا اور ڈاکٹر ز اس درد کو ان کا وہم قرار دیتے تھے۔

دریہ نے اندر آکر لائٹ جلائی، تب ان کا وجود کسی آن دیگی گرفت سے آزاد ہوا۔ کسی پر ایک طرف کو جھک کر وہ گہرے گہرے سانس لینے لگے۔

”احسن۔ احسن۔ کیا ہوا ہے؟“ وہ بے حد پریشانی کے عالم میں ان کا کندھا تھکا کر پوچھنے لگیں۔

”ڈاکٹر کو فون کروں؟“

”نہیں دریہ۔ نہیں۔“ انہوں نے بے بسی سے اٹھ کر جاتی دریہ کا ہاتھ تھاما۔ ”یہاں بیٹھی رہو میرے پاس۔“

”احسن۔“ وہ رو دینے کو ہو گئیں ”کرنے دیجئے فون۔“

”میں ابھی آتی ہوں۔“

”دریہ پلیز۔ مجھے تنہا چھوڑ کر مت جانا۔“ انہوں نے منت کی۔

وہ پریشانی سے انہیں تکتے ہوئے ان کا سینہ سہلا لگیں۔

”پانی پی لیں۔“

”ہاں، ٹھیک ہے بھر دو گلاس۔“

کی پشت سے لگا دیا۔

”احسن! کیا ہو جاتا ہے آپ کو؟ گلاس بھرتے ہوئے وہ بول رہی تھیں آپ بالکل ٹھیک ٹھاک، نارمل انسان ہیں۔ سارے ڈاکٹر ز یہی کہتے ہیں۔ ہر ٹیسٹ رپورٹ صحیح ہوتی ہے، پھر یہ کیسا درد اٹھاتا ہے آپ کو۔ اور آپ اپنی دیر تک بیدار رہیں کیوں نہیں آتے، طبیعت ٹھیک نہیں تھی، پھر بھی اسٹڈی میں بیٹھے رہے۔“

”دریہ۔“ انہوں نے پانی پی کر گلاس ساؤنڈ میل پر رکھا۔ ”تم نے اس شخص کی چیخ دیکھا نہیں سنی؟“

”ستی تھی، اس کا درد محسوس بھی کیا۔ رونی بھی لیکن پھر نارمل ہو گئی۔“ وہ دن گزر چکے ہیں اس واقعہ کو۔ کمال ہے آپ ریٹائرڈ ایس پی ہیں، آپ نے اتنا فیل کیا؟ آپ نے تو اپنی زندگی میں ایسے بے شمار کیسز دیکھے ہوں گے۔“

دریہ نے جب کہیں، جہاں کہیں، کسی مظلوم لڑکی کی عزت داؤ پر لگتی ہے، مجھے یوں لگتا ہے کہ اس کا گناہ میرے نامہ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے۔“

ان کی آواز بھرا گئی۔

”لیکن کیوں احسن کیوں؟“ وہ زچ ہوئیں۔ آپ کا

س سارے وقت میں کہاں کوئی قصور ہے؟ آپ نے

تو اس غریب کی مدد ہی کی نا۔ اس بے چارے کی زندگی

اب بھی کچھ خوشگوار تو نہیں گزرے گی، لیکن پھر بھی وہ اس

اذیت ناک سوال کی زد میں نہیں رہے گا۔ کہ اس کی

بیٹی کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ کم از کم وہ اس کی قبر

پر قلم لکھ کر پڑھ سکے گا نا۔ پھر یہ خلش آپ کے دل میں

کیوں رہ گئی ہے کہ اس سارے قصے میں کہیں کوئی قصور

آپ کا بھی ہے۔؟“

انہوں نے ایک بے بس، بے چین نگاہ ان پر ڈالی۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

”میری خواہش تھی کہ میں اس لڑکی کی مدد کرتا۔“

ہوئے سے بڑبڑا کر وہ بولے۔

”جی۔“ سر شریف، نیک شخص ایسا ہی چاہتا ہے۔“

وہ نرمی سے ان کا کندھا دبا کر بولیں

”لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکا، تب بھی آپ بے قصور

ہیں جس کیوں فضول سوچوں میں گھومتے رہتے ہیں پیچھے
 اٹھ کر جیسا کہ میں چاہوں اور نیند کی گولی کھا کر سو جائیں
 آپ جان بوجھ کر نہیں سوتے ہیں یہی سبب ہے
 آپ کی۔
 "تم پلور دیتے ہیں حقوڑی دیر میں یہاں ہوں۔ وہ نرمی
 سے بولے۔

"حسن۔"
 "دیکھو صبح ہیں نے نیند کی گولی کھالی تب بھی جاگ
 ہی رہوں گا۔ میں خود سے واقف ہوں، اس سے بہتر
 یہ ہے کہ میں کچھ پڑھ لوں تو نیند محسوس کرے ہی سوتے
 کے لیے انھوں۔ اب تم جاؤ، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"
 "بیکن حسن۔"

"پلیز ورتیہ۔ آئی ایم آل رائٹ ناؤ۔ جاؤ شامش
 تمہیں نیند آرہی ہے، جا کر سو جاؤ۔"
 "کبھی کبھی آپ کو کچھ بالکل ٹھیک لگتا ہے۔"
 کرتے ہیں۔ "وہ شکایتیں بولیں اور کرا سڈی سے
 نکل گئیں۔"

دیر کے جانے کے بعد انہوں نے کتابوں کے مختلف
 شیف بری دین تک دیکھے، لیکن کوئی بھی کتاب پر
 کا فیصلہ نہ کر سکے۔
 چکے تھے نیند بہت پہلے انہیں پھول مرچیں کسی فقی۔
 کتنی برس پہلے اور نیند سے وہ جاگ رہے تھے کتابیں پڑھتے
 تھے سوچتے تھے اور رات بھر جاتی تھی۔ اور یہ کیسا
 دردناک عذاب تھا۔ وہی جانے لگے۔

اور دودن سے وہ مسلسل جاگ رہے تھے۔
 دردناک عذاب کا شکار تھے دودن پہلے انہوں نے اپنے
 ذاتی اثر و رسوخ سے کام لے کر جو مددنی عنایت کے
 نیٹکے پر چھاپہ پڑوایا تھا۔ اور ناشی کے دوران تھانے
 کی کچی زمین سے سنہرے لاش پر آمد کر لی گئی تھی۔ وہ
 لاش، وہ بے بسی اور مجبوری کا پیکر، وہ عورت کی۔
 مطلوبیت کی منہ بولتی تصویر ان کے ذہن کے پردے
 پر نقش ہو گئی تھی۔ ایسی ہی پھیل گئی دوسری تصویریں
 کے ساتھ۔

اپنی ملازمت کے دوران ایسی کتنی ہی تصویریں
 وہ دیکھ چکے تھے اور ان کا ذہن ایک الجھن کی طرح ان

سب کراہتی تھیں میں حفاظت کے ساتھ رکھتا گیا تھا۔
 اور اس الجھن کے بننے کا باعث وہ تصویر تھی جو سب سے
 بہت شہرت ہوئی تھی۔ کچھ اس طرح کہ اب میں تنہا ہی
 اس کو دیکھنے والی ہو جاتا تھا۔ بولنے لگتا تھا، مزید
 کرنے لگتا تھا۔

"میں تم سے اپنی معصومیت، اپنی سادگی، اپنی عزت
 کا خون بہا طلب نہیں کروں گی۔ ایس پی آسن جیلانی صاحبہ
 اور تم ہی اسے معاف کروں گی۔ میں اس سے وصول کروں
 گی۔ لیکن یہاں نہیں، بلکہ اس جگہ جہاں ایک دن
 ظالم اپنے مظالم کے سامنے جوابدہ ہوگا۔"

آسن جیلانی نے سگریٹ جلائی اور گہرے گہرے
 کش لینے لگے۔ ان کے اندر ایک جوار بھانا اٹھ رہا تھا،
 ماضی، حال اور مستقبل کی لہریں ایک دوسرے کو اپنی لپیٹ
 میں سے رہی تھیں۔ نقش مٹ رہے تھے۔ انھیں
 سیاہ مہیب سڈی کے اندر ٹھانڈی مارتے لگا
 ان کے وجود کی ہر دیوار کے ٹکڑے ٹکڑے لگے۔ اپنے اسڈی
 روم سے نکل کر وہ کہیں دور وادے تک ایک چھوٹے سے
 گاؤں میں پہنچ گئے۔

وہ اپنے خاں خاں کے
 سرسبز گاؤں میں آئے وہاں صرف چند منٹ کے
 لیے رکتی تھی۔ اگر اس کی برابری والی طبیعت پر پیچھے
 میاں اسے نہ جگاتے تو وہ پورے سوتے بچائے کہاں
 پہنچ جاتا۔

وہ اپنے خاں خاں کے
 مار کر پلٹ فارم پر کو داتا تھا۔

"ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں" گنگنائے ہوئے
 اس نے رسٹ وارج پر نگاہ ڈالی اور آگے چل دیا۔
 آج سے پہلے وہ محض ایک باریاں آیا تھا۔ دریاخان
 کی شادی کے موقع پر۔ اور اب قریباً تین سال بعد وہ
 یہاں آیا تھا۔

گنگوٹھی پر چلتے ہوئے اس نے آس پاس کے
 کھیتوں پر نگاہ ڈالی۔ سر دیاں قریب تھیں اور رضا
 کمر آلود ہو رہی تھی۔ کچھ گھروں سے اوپر کو اٹھتے دھوپ
 کے بادلوں کو وہ دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اور تب ہی اس

کن نگاہ دور اور بچی جگہ پر بنی عالی شان حویلی پر برجیوں
میں لکھ گئی۔

”واہ بچی۔ اس نے ٹھنڈی آدھ بھر کر سوچا۔ لوگ
دنیا میں اگر کیسے کیسے محل بنانا چاہتے ہیں۔ ہم سے ایک
زندگی کی بنیاد ٹھیک سے نہیں ڈال جاتی۔ احسن جلالی
صاحب! آپ کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ آفسیر بننے کے
خواب دیکھتے دیکھتے ٹیوشن ماسٹر بن جانا!“
چلتے چلتے جب وہ ایک شفاف، رواں ندی تک
جاسپنچا تب اسے احساس ہوا کہ وہ غلط سمت میں نکل
آیا ہے۔

”سنو میا!“ اس نے وہاں کھیلنے بچوں میں سے ایک
کو مخاطب کیا۔ ”یہ دریا خان کا مکان کہاں ہے؟“
وہاں۔ ”بچے نے محض ایک سمت میں اشارہ کر دیا تھا
کافی سمجھا۔

اس کی نگاہ نے اس کی انگلی کے تعاقب میں دیکھا
اور ناکام لوٹ آئی۔

”مجھے وہاں تک چھوڑ دو۔“ وہ بے بسی سے بولا تھا۔
”چلو۔“ وہ فوراً مان گیا۔

باقی بچوں نے بھی ان کا ساتھ دینا مناسب خیال کیا
اور یوں وہ ایک قافلے کی صورت میں دریا خان کے گھر
تک پہنچے۔

”بھٹے یقین تھا تم آؤ گے۔“
دریا خان نے برقعہ گیم جوشی سے اس کا استقبال
کیا تھا۔

”مجھے یقین تھا میں نہیں آؤں گا۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔
”لیکن بعض اوقات ہم فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں تو
ہوتے ہیں، لیکن ہمارے سامنے محض ایک ہی راہ ہوتی
ہے۔“

”نکال دو یا ماموں نے؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں نکالا تو نہیں۔ لیکن رکھا بھی نہیں۔ ٹھیک ہے
بار ٹھیک ہی ہے۔ اپنے گھر کے ماحول کو وہ میری وجہ سے
خراب تو نہیں کر سکتے تھے نا۔ ان کی تین جوان بیٹیاں ہیں
اور ماخی کو یقین ہے ان میں سے کوئی ایک ضرور مجھ سے
سنجیدہ ہو کر اپنا مستقبل تباہ کرے گی۔“

”اوسے تو گھروں ہی ایسا ہے۔“ دریا خان زور سے ہنسا۔
”محض گھروں کو کوئی نو جوان کسی لڑکی کو اچھا مستقبل

نہیں دے سکتا۔ وہ سبھی گھروں کے لیے ہی رہتا ہے۔“
”لیکن بعض اوقات ہم فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں تو
ہوتے ہیں، لیکن ہمارے سامنے محض ایک ہی راہ ہوتی
ہے۔“

”نکال دو یا ماموں نے؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں نکالا تو نہیں۔ لیکن رکھا بھی نہیں۔ ٹھیک ہے
بار ٹھیک ہی ہے۔ اپنے گھر کے ماحول کو وہ میری وجہ سے
خراب تو نہیں کر سکتے تھے نا۔ ان کی تین جوان بیٹیاں ہیں
اور ماخی کو یقین ہے ان میں سے کوئی ایک ضرور مجھ سے
سنجیدہ ہو کر اپنا مستقبل تباہ کرے گی۔“

”اوسے تو گھروں ہی ایسا ہے۔“ دریا خان زور سے ہنسا۔
”محض گھروں کو کوئی نو جوان کسی لڑکی کو اچھا مستقبل

فراہم نہیں کر سکتا۔ وہ سنجدگی سے بولا۔ ”مامی کو میری
وجاہت سے نہیں، میری بے سرو سامانی سے غلط تھا
میرے پاس ایک حد درجہ اچھی نوکری ہوتی تو وہ خود مہلو
سے کہہ کر ان تینوں میں سے کسی ایک سے میری شادی
جلد سے جلد کر اتیں کہ گھر کا دیکھا بھالا لڑکا کہیں باہر نہ
پھنس جائے۔“

ٹھیک ہی ہے ہر ماں اپنی بیٹیوں کا بھلا چاہتی
ہے۔“

”وہ خود کو میری بھی ماں سمجھ سکتی تھیں؟“
”تم بتاؤ۔“ اس نے جان بوجھ کر موضوع بدل دیا۔ ”لوگو“

”یہ نواب مجھے بھی خبر نہیں۔ اس کے بعد حویلی جانا نہیں
ہوا۔ تم نے آئے ہیں دن بھی تو لگا دیے۔ امتحان دے
رہے تھے؟“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔
”کیسا ہوا امتحان؟“

”بس بار۔ اس طرف سے بھی امید نہیں ہے۔ یہ نہیں
ہے کہ امتحان اچھا نہیں ہوا۔ پیپرز شاندار دیے ہیں۔
لیکن بارہ طرف سفارش اور رشوت کا۔ بازار گرم
ہے۔ ہم جیسے بے نامہ فقیروں کو کون پوچھتا ہے۔“

”بہت کچھ ہو رہا ہے موم۔“
”لب پر ہے مٹلنی آیام ورنہ فیض۔“ وہ ہنس دیا۔
”چلو مجھے وہاں لے چلو، تاکہ میں آخری امید کا بھی تصفیہ
ہو جائے۔“

”نہیں اب مجھے رات اتر رہی ہے کل صبح چلیں گے۔
تم پورا دن کا سفر کر کے آئے ہو۔ ابھی کھانا کھا کر آرام کرو
تاکہ دماغ سے تھکن اترے۔“

”ارے سہی جان بہ برسوں کی تھکن ہے۔“ وہ کھڑی
چارپائی پر ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ ”ایک رات
کے آرام سے کیا خاک اترے گی۔“

دریا خان دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا۔ تو وہ
شدید تھکن کے باوجود اپنے حالات پر سوچتا رہا۔ بچپن
سے وہ اپنے ماموں کے ساتھ ہی رہتا تھا کہ رہنے کے
لیے کوئی ٹھکانا اس کے پاس تھا نہیں، سرکاری اسکول
اور کالج میں غیر معیاری تعلیم حاصل کر کے اس نے پیشگی
بی۔ کام پاس کیا تھا، اور بنا کسی امید کے نوکری کی

”ارے سہی جان بہ برسوں کی تھکن ہے۔“ وہ کھڑی
چارپائی پر ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ ”ایک رات
کے آرام سے کیا خاک اترے گی۔“

دریا خان دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا۔ تو وہ
شدید تھکن کے باوجود اپنے حالات پر سوچتا رہا۔ بچپن
سے وہ اپنے ماموں کے ساتھ ہی رہتا تھا کہ رہنے کے
لیے کوئی ٹھکانا اس کے پاس تھا نہیں، سرکاری اسکول
اور کالج میں غیر معیاری تعلیم حاصل کر کے اس نے پیشگی
بی۔ کام پاس کیا تھا، اور بنا کسی امید کے نوکری کی

”ارے سہی جان بہ برسوں کی تھکن ہے۔“ وہ کھڑی
چارپائی پر ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ ”ایک رات
کے آرام سے کیا خاک اترے گی۔“

دریا خان دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا۔ تو وہ
شدید تھکن کے باوجود اپنے حالات پر سوچتا رہا۔ بچپن
سے وہ اپنے ماموں کے ساتھ ہی رہتا تھا کہ رہنے کے
لیے کوئی ٹھکانا اس کے پاس تھا نہیں، سرکاری اسکول
اور کالج میں غیر معیاری تعلیم حاصل کر کے اس نے پیشگی
بی۔ کام پاس کیا تھا، اور بنا کسی امید کے نوکری کی

”ارے سہی جان بہ برسوں کی تھکن ہے۔“ وہ کھڑی
چارپائی پر ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ ”ایک رات
کے آرام سے کیا خاک اترے گی۔“

دریا خان دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا۔ تو وہ
شدید تھکن کے باوجود اپنے حالات پر سوچتا رہا۔ بچپن
سے وہ اپنے ماموں کے ساتھ ہی رہتا تھا کہ رہنے کے
لیے کوئی ٹھکانا اس کے پاس تھا نہیں، سرکاری اسکول
اور کالج میں غیر معیاری تعلیم حاصل کر کے اس نے پیشگی
بی۔ کام پاس کیا تھا، اور بنا کسی امید کے نوکری کی

”ارے سہی جان بہ برسوں کی تھکن ہے۔“ وہ کھڑی
چارپائی پر ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ ”ایک رات
کے آرام سے کیا خاک اترے گی۔“

تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا، جو کہ تمام اسے حاصل نہ ہو سکی تھی۔ ٹھیلہ لگانے یا جوتوں کی دکان پر بیٹھنے کو اس کا دل تیار ہی نہ ہوتا تھا کہ بچپن سے آنکھوں میں بڑا آفیسر بننے کے جو سنہرے پے اس نے بجائے تھے ان کے پر چلنے پر اس کا پورا وجود شدید تکلیف محسوس کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ انتہائی مجبوری کے عالم میں بھی اسے کم از کم کلرک کے درجے سے نیچے نہ آنا پڑے۔

زندگی میں ایک بلند مقام حاصل کرنے کی دھن سر میں سمائی تو اس نے سی ایس ایس کی تیاری شروع کر دی۔ نوکری کی تلاش لا حاصل کو ترک کر کے وہ سارا سارا دن لائبریری میں بیٹھا رہتا۔ گھر آتا بھی تو صرف کھانا کھانے کے لیے اور یہی بات سمائی کے لیے انتہائی فکر و پریشانی کا باعث تھی کہ اس عمر کا جوان سوائے روٹیاں توڑنے اور لڑکیوں کو گھورنے کے کچھ نہیں کرتا۔ روٹیاں توڑنے والی بات ٹھیک تھی، اور اس نے ہنا کھسی پس و پیش کے تسلیم کر لی تھی۔ لیکن دوسرا التزام برداشت کر لینا قطعاً ناممکن تھا۔ وہ اسی گھر میں پل بڑھ کر جوان ہوا تھا۔ لڑکیوں کو اس نے ہمیشہ اپنی بہنیں سمجھا تھا انہیں غلط نظر سے دیکھنے کا التزام اس کے لیے ایسی تکلیف اور گھٹن کا باعث بن گیا۔ کہ اسے اس گھر میں قدم رکھتے ہوئے بھی شرم محسوس ہونے لگی۔

انہی حالات میں اسے دریاخان کا خط موصول ہوا۔ دریاخان اس کے بچپن کا دوست تھا اور اس کے ساتھ اسکول اور کالج میں زیر تعلیم رہا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اپنی زمینیں سنبھالنے کی غرض سے وہ اپنے آبائی گاؤں واپس لوٹ گیا تھا اور وہیں اس نے اپنی چچا زاد سے شادی کر لی تھی۔ حسن جیلانی بھی اس شادی میں شریک ہونے کے لیے آیا تھا اور تبھی اس نے دریاخان کا گاؤں دیکھا تھا۔

دریاخان نے اپنے خط میں اسے ایک نوکری کی بابت کھا تھا۔ اس کے گاؤں کے بڑے زمیندار کی بیٹیوں کو گھر پر تعلیم دینی تھی۔ اور اس کے لیے اسے ایک خاص پیکٹش معاوضے کی پیش کش بھی کی تھی۔

لیکن احسن نے وہ خط پڑھ کر بے دلی سے ایک جانب ڈال دیا تھا۔ معاوضہ پیکٹش ضرور تھا لیکن یہ اس کی منزل نہ تھی، اس کی آنکھوں میں بلند یوں کے سپنے

تھے۔ فطرتاً وہ شاہین تھا۔ ذرا ذرا سے دانے کے لیے زمین پر اترتا اسے گوارا نہ تھا۔ اس نے امتحان دیا اور ایک بار پھر فٹ پاتھوں پر جوتیاں چھانے لگا۔ اور وہ رزلٹ آنے تک یا شاید اس کے بعد بھی یہی کرتا رہتا۔ اگر ایک رات ماموں اور مامی کی گفتگو نہ سن لیتا۔ مامی کا خونخوار لہجہ، تیتے الفاظ اور ماموں کی کمزور، ٹوٹی پھوٹی مدافعتی گفتگو نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ اسے کسی سے شکایت نہ تھی۔ اس گھر کی شکستہ دیواروں نے بہت عرصہ تک اسے زمانے کے سرو و گرم سے بچائے رکھا تھا۔ اور اب واقعی یہ اس کا فرض بنتا تھا کہ اس گھر کے مکینوں کی مشکلوں کو کم نہ کر سکتا ہو تو ان میں اضافہ بھی نہ کرے۔ ہر خند کہ بیاس کا ارمان تھا کہ وہ ابھی سی نوکری ملنے کے بعد اپنی ماموں زاد بہنوں کے رشتے تلاش کرے، انہیں باغزیت رخصت کرے، اور ماموں اور مامی کی خدمت کر کے ان کے احساؤں کا بوجھ کم کرنے کی اپنی سی سعی کرے۔ لیکن اس کی اپنی فکرت اس کے ارمانوں کی کھلی مخالفت پر تلی ہوئی تھی۔ سو وہ کیا کر سکتا تھا۔

اس نے دریاخان کا خط تلاش کیا اور اپنے ایک عزیز دوست کو ساری بات بنا کر یہاں چلا آیا۔ ماموں کا از خود سامنا کر کے ان کا کھجکا ہوا سر اور شرمندہ نظر دیکھنے کی اسے تاب نہ تھی۔

اگلی صبح اسے چڑیوں کی بے تحاشا جھکار نے جگایا۔ آنکھیں ملتا ہوا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باہر صحن سے آتی آوازوں سے اسے اندازہ ہوا کہ یہاں علی الصبح گھر کے تمام افراد جاگ کر اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے، اور دریاخان کے گھر میں اس کی بیوی اور دو بہنوں کے سوائے تھا ہی کون۔

دلشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر اس نے غسل کر کے باس تبدیل کیا اور دریاخان کی ہمراہی میں حویلی کی جانب چل دیا۔ کھیت کھدیاں، پگڈنڈیاں، شفاف پانی لانی چھوٹی چھوٹی نالیاں۔ اسے ہر شے بڑی نکھری، بڑی پاکیزہ لگی۔

”یار دریا، فطرت انسان کی سب سے بڑی دوست ہے، مجھے اکثر احساس ہوتا ہے۔“

”حسن۔ آبا کے انتقال پر میں سوچتا تھا کہ میں شہر میں پلا بڑھا شخص کس طرح یہاں کی زندگی میں اڈ بیٹ

ہو سکوں گا۔ زمینوں میں مل چلا تا کیسا لگوں گا۔ ایک قطعاً
 اُن پڑھ، جاہل لڑکی سے کیسے نباہ کر پاؤں گا۔ لیکن اب
 مجھے یقین ہو چلا ہے کہ انسان بنا تو مٹی سے ہے ایک
 فطرت پانی کی سی رکھتا ہے جس برتن میں ڈال دو وہی
 شکل اختیار کر لیتا ہے، جس رنگ میں ملاؤ وہی رنگ
 اپنا لیتا ہے، بگڑا ہوا ہو تو سیلاب بن کر سرے کو تباہ
 کر ڈالتا ہے، اور سدھرا ہوا ہو تو زندگی میں دور دور
 تک سبزہ لگا دیتا ہے پھول کھلا دیتا ہے۔ بارگاہوں
 آکر میں نے خدیجہ سے شادی کی تو مجھے پتا لگا کہ عورت نور
 ہوتی ہے۔ چاہے اس کا تعلق دنیا کے کسی حصے، کسی گوشے
 سے ہو، ایک شیشے کی بوتل، جس پر آپ کسی طرح کا بھی لیبل
 لگا دیں۔ شہر کا یا گاؤں کا۔ بوتل شیشے کی رہتی ہے اس
 کی ساخت وہی رہتی ہے۔ اسی طرح عورت ایک ہے
 اس کی خواہشات ایک سی ہیں۔ دینے اور لینے کے بنیادی
 اصول ایک سے ہیں۔ میں نے کبیت میں مل چلا تا محسوس
 کیا کہ میں یہی تھا اور یہی ہوں۔ ایک کسان جو دھرتی کا
 سینہ پھاڑ کر اپنا رزق نکالتا ہے، لہو کا پسینہ بناتا ہے
 اور وہ پسینہ خاک میں ملا دیتا ہے۔ اور وہی خاک پھر اسے
 رزق اگلتی ہے۔ یہ ایک چکر ہے اور میں ہمیشہ سے اس
 چکر کا ایک حصہ ہوں۔ میں نے اس سائے سیٹ اپ
 کو اس طرح سے قبول کیا جیسے میں ہمیشہ سے یہی تھا جیسے
 میں یہاں سے کہیں گیا ہی نہیں۔ اسی طرح احسن جیلانی
 تم محسوس کرو گے کہ جہاں ہوا اور جیسے ہو۔ تم درحقیقت یہی
 چاہتے تھے، بارہا انسان سنہرے سینوں کی سنہری پری کو
 چھو نہیں پاتا، کیڑے نہیں پاتا تو بہت جلد اس کی آنکھیں
 اپنے ارد گرد بسنے والی حقیقتوں سے سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ یہی
 انسانی فطرت ہے۔ یہاں آنے سے قبل تم ضرور مایوسی اور
 ڈیسپریشن کا شکار رہے ہو گے کہ گاؤں کی زندگی میں کیسے
 گھل مل سکے، لیکن آج تمہیں یہی فطرت اپنی دوست
 لگتی ہے۔

وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا اور چلتا رہا۔
 بنجانے دریا خان درست کتنا مضبوط غلط۔ لیکن اس کے
 اپنے اندر کہیں یہ طے تھا کہ سمجھوتے ہو تو جاتے ہیں لیکن
 ایک ایسے بند دروازے کی مانند ہوتے ہیں جس میں سے
 پھر کوئی امید، کوئی خوشیوں بھرا خواب انسان کے دل
 کے اندر نہیں جھانک پاتا۔ جیسا اس نے سوچا تھا، تو کچھ

اس نے چاہا تھا۔ اگر وہ بیان نہ سوتا تو وہ سمجھوتا تو کر رہی
 لیتا۔ ہاں کبھی خوش نہ ہو سکتا تھا۔ آنا وہ جانتا تھا۔
 دریا خان اگر آج اپنی زندگی سے مطمئن بھی تھا اور خوش
 بھی، تو یہ بہت پہلے اس کے اندر کہیں طے ہوا ہوگا۔
 ”لوجی۔ آگنی منزل۔“

دریا خان کی آواز پر وہ چونک کر خیالوں کے سفر
 سے اُبھرا۔ اس کے سامنے وہی عالی شان۔ پیر شکوہ جیلانی
 کھڑی تھی جس کی برہنجیوں نے کل اس کے اندر عجیب
 کے گل کھلائے تھے۔

”اندر اطلاع کرو دریا خان ماسٹر صاحب کو کہ
 آیا ہے۔“ دریا خان جو کیدار سے مخاطب تھا۔
 احسن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
 ”نہیں۔ یہ میری منزل نہیں۔“ اس کے اندر کوئی
 چلا یا۔

”بیگم صاحب اندر بلاتی ہیں۔“ چوکیدار چند منٹوں میں
 لوٹ آیا تھا۔

بڑا سا صحن عبور کر کے چوڑا سر آمدہ تھا۔ جس میں تین
 اطراف میں راستے بنے تھے، ایک ملازم کی رہنمائی میں
 وہ ایک بڑے گول کمرے میں پہنچے۔ موٹے قالین پر چلے
 ہوئے، وہ گدے بے صوفے میں دھنسی بھی چوڑی خاتون
 کے روبرو پہنچ گئے۔

”السلام علیکم بیگم صاحب جی!“ دریا خان نے باادب
 سلام پیش کیا۔
 احسن نے تقلید کی۔

”ہو بیٹو دریا خان!“ انہوں نے سلام کا جواب دیے کی
 ضرورت نہ سمجھی۔ ”تم بیٹو ماسٹر!“ اس نے عجیب سی تذیل
 محسوس کی اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔
 ”اب آئے ہو دریا خان۔“

”بیگم صاحب۔ یہ میرا دوست اپنا امتحان دے رہا تھا
 اس سے فارغ ہو کر آیا ہے۔“
 ”ہوں۔ کتنا پڑھا ہے؟ اب روئے سخن اس کی جانب
 تھا۔

”جی۔ میں نے بی کا کیا ہے، اور اب سی ایس ایس
 کا انکزام دے کر آیا ہوں۔“
 ”وہ کون سا امتحان ہے، یہ بتاؤ کتنی کلاس پڑھے
 ہوئے ہو۔“

اسے خاتون کی انتہا درجے کی کم علمی کا احساس ہوا۔
 ”جی چودہ جماعت پاس ہوں۔“
 ”ہوں۔ اب پندرہویں کا امتحان دیا ہے۔ انہوں
 نے مذہب پر انداز میں سر ملا دیا۔
 ”جی!“ اس نے تانسف سے محض اتنا کہنا کافی سمجھا۔
 ”ٹھیک ہے تعلیم تو کافی ہے لیکن۔“ انہوں نے اپنے
 بے تحاشا جسم کی وجہ سے بمشکل پہلو بدلا۔
 ”لیکن کیا بیگم صاحب۔ میرا دوست بڑا قابل آدمی
 ہے۔“

”ہاں ہاں وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن اس کی عمر۔
 حلیمہ کے بابا کوئی ادھیڑ عمر۔ یعنی میسر مطلب ہے۔“
 ”جی بیگم صاحب۔ میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“
 دریا خان نے طبعی جلدی کہنا شروع کیا۔
 ”لیکن آپ احسن پر اتنا ہی اعتبار کر سکتی ہیں جتنا
 کہ مجھ پر کرتی ہیں۔ اس کی شرافت کی ضمانت میں دیا ہوں۔
 اصل میں یہ بے چارہ بڑا ضرورت مند ہے۔“
 احسن نے بے چینی سے ادھر ادھر دکھا۔
 ”اچھا۔“ بیگم صاحب کچھ کش مکش کا شکار تھیں۔
 ”چلو۔ ٹھیک ہے۔ کیا تنخواہ مانگتا ہے یہ؟“
 ”آپ جو دیں وہ مناسب ہوگا۔“
 احسن نے ایک نظر اسے دیکھا جو اب اس نے اسے
 خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
 ”اچھا۔ ماسٹر تم ہیں بیٹھو میں لڑکیوں کو پڑھاتی ہیں۔
 دریا، اب تم جاؤ۔“
 وہ بمشکل اٹھ کر اندر کسی پردے کے پیچھے گم ہو
 گئیں۔

”یار دریا۔ مجھے تو مشکل لگ رہا ہے۔“
 ”کوئی مشکل نہیں ہے۔ یہ بظاہر ایسی ہی اندر سے
 قطعاً خانہ خالی ہے۔ کچھ آتا جاتا نہیں، جو کہو گے آنکھ بند
 کر کے مان لیں گی۔ لڑکیاں بھی ایسی ہی ہیں۔ پڑھنے لکھنے
 کا تو شوق ہے نہیں، وی سی آر اور ڈش دیکھ دیکھ کر
 فیشن سیکھ گئی ہیں۔ مواب کچھ پڑھ لینے کا بھی خیال آگیا
 ہے۔ بہت آسان سی جاب ہے۔“
 ”لیکن تم نے تو فیس وغیرہ کا بھی کچھ نہیں کہا۔“
 ”ارے میری جان! مذہبی لپٹی نہیں ہیں۔ جتنے دن
 یہاں نوکری کرو گے، جیب اور منہ دونوں بھرے رہیں

اس کی تم فکر مت کرو۔ اچھا میں اب چلتا ہوں۔ تم
 اچھی طرح پڑھانا، پہلا دن ہے، اچھا امپریشن ڈالنا۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔
 ”راستہ تو گھڑنگ کا یاد ہے نا؟“
 ”بھول بھی گیا تو کسی نہ کسی طرح پہنچ جاؤں گا۔“ وہ
 ہنس دیا۔
 ”دیش گڈ۔“

وہ اس کا شانہ چھتیا کر باہر نکل گیا۔
 اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر اس کی نگاہ بیکام
 محکم گئی۔ میروں و میز سروں کے پیچھے کوئی لڑکی بھپ
 کر اسے دیکھ رہی تھی۔ جسے اس بات کا بھی احساس نہ
 تھا کہ اس کے پیر نیچے سے دکھائی دے رہے تھے۔
 چاندی کی پازیب سے سجے، سانولی رنگت کے نازک
 پیر اس نے چند لمحے دیکھے پھر اندر آتی لڑکیوں نے اس
 کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ وہ تین لڑکیاں تھیں
 عمریں پچیس سے بیس کے درمیان ہوں گی۔ گہرے
 گہرے رنگوں کے ریشمی سوٹ پہنے، پیر اندے ڈالے
 چھم چھم کرتی وہ تینوں لائن سے اس کے سامنے بیٹھ
 گئیں۔
 ”السلام علیکم۔“ اس نے ایک نگاہ ان پر ڈالی۔
 ”جی سلام ماسٹر صاحب!“ سب نے ہنسی سے جواب
 دینے کا لطف کیا۔

”مجھے احسن جیلانی کہتے ہیں۔ میں آج سے آپ لوگوں
 کو پڑھاتا ہوں گا۔“
 ”پڑھائیں جی۔“
 ”آپ کی بکس وغیرہ۔“
 ”وہ تو منگوائی ہیں۔ اماں کہتی ہیں آپ نام اکھ
 دیں۔ کل شہر سے آجائیں گی۔“
 ”اچھا۔ کون کون سے مضمون پڑھیں گی آپ
 لوگ۔؟“
 تینوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔
 ”بس جی۔ پڑھنا لکھنا آجائے۔ اردو اور انگریزی۔“
 ”یعنی۔“ وہ ایک ٹانے کو شدید رہ گیا۔ آپ
 لوگوں نے قطعاً کچھ نہیں پڑھ رکھا۔“
 ”پڑھا ہوا ہوتا تو کیوں لگاتے آپ کو؟ ایک نے
 اعتراض کیا۔

”جی۔“ اس نے سر ہلایا: ٹھیک فرمایا آپ نے۔
لڑکیوں کی علمی استعداد کا بخوبی اندازہ کر لینے کے بعد
ابتداً اس نے الف بے اور اے بی سی سے کی اور لیا
کرتے ہوئے اس کا رد دینے کو جی چاہ رہا تھا۔

تینوں کو ایک ایک صفحہ کھنے کا کام دے کر اس نے
صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی ہی تھی کہ کسی نے بڑے
باادب طریقے سے چائے کی پیالی اس کے آگے کر دی۔
احسن نے چونک کر سر اٹھایا۔ سیاہ بھونٹا آنکھیں
ایک لمحے کو اس کی نظروں سے متصادم ہوئیں پھر ان
پہر پلکوں کی چلن آگری۔ احتراماً اس نے بھی نگاہ جھکا
لی۔ اور تب وہ سانوے، نازک پیراس کی نگاہوں کی
زد میں آئے، تو یہ تھی وہ لڑکی جو اسے چھپ کر دیکھ رہی
تھی۔

”شکریہ۔“ کپ مقام کر اس نے مدھم آواز میں
کہا۔

وہ بے آواز واپس مڑ گئی۔

”سوہنی۔“ بانی لا کر دے پہلے ماسٹر صاحب کو۔
کم بخت چائے کا کپ لا کر سر پر مارتی ہے۔ تینوں میں
سے ایک نے اسے آواز دی۔

”جی آپا۔“ پردے کے پاس رک کر وہ مدھم آواز
میں بولی۔

احسن نے ہنسنے آواز سنی اور نام پر مسکرا دیا۔

”اسم، اسمی۔“ اس نے سوچا تھا۔

چند لمحوں بعد بانی کا گلاس اس کے روبرو تھا۔

”جی شکریہ۔“ سر اٹھائے بغیر اس نے گلاس اٹھا
سے تھا۔

واپسی پر وہ قدرے غیر مطمئن تھا۔ لیکن اس نے

دراخان سے کچھ بھی نہ کہا۔ اور وہ کتنا بھی کیا۔ یہ کہ وہ

پڑھانے تو آیا تھا لیکن الف بے یا اے بی سی نہیں۔

یہ تو ایک قطعاً غیر معقول بات ہوتی۔ پڑھانا تو اسے
تھا ہی۔ پھر اعتراض لیا۔

چند ہی دنوں میں اسے تینوں لڑکیوں کی تمام تر

قابلیت اور صلاحیتوں کا اندازہ ہو گیا۔ حلیمہ، شمیمہ اور

سلیمہ نامی ہم قافیہ نہیں۔ رولف اور سحر چیمبر میں
میں برابر اور ہم وزن تھیں۔ ایک سے نام، ایک سی

شکلیں اور ایک سے دماغ۔ مزید یہ کہ کپڑوں اور

زیورات کا شوق بھی ایک ساتھ اور غالباً محض یہ ایک
شوق تھا۔ پڑھنا لکھنا تو ایک مجبوری تھی کہ فی دہائی
گاؤں سے باہر کی دنیا دیکھ دیکھ کر انہیں بھی دیباہی
بننے کا شوق جبرایا تھا۔

”ماسٹر جی۔“ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں چھوڑیں، مجھے تو
آپ سب سے پہلے انگریزی بولنا سکھا دیں۔“

ایک دن شمیمہ نے بے زاری سے رائٹنگ کا کام
ایک طرف کر کے کہا تھا۔

”انگریزی بولنا سکھا دوں؟“ وہ بھونچکا رہ گیا۔

”یعنی ڈائریکٹ؟“ بی بی! اینٹ پر اینٹ رکھے بنا
دیوار کیسے کھڑی کر لوگی؟“

”لیکن یہ کام تو بہت بُرا ہے۔ جیسا لفظ آپ بنائیں
نیچے ویسے ویسے بناتے جاؤ۔“ یہ بھی کوئی کام ہوا؟“

”تو باتیں نہ بنا۔“ بڑھ بڑھ کر۔ ”حلیمہ نے ماسٹر صاحب
کی مشکل آسان کی اور چھوٹی بہن کو ڈانٹ پلائی۔ بڑی

قابل ہے۔ ماسٹر صاحب زیادہ جانتے ہیں کہ تو؟“

شمیمہ نے اسے گھورا اور گلابی کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”ماسٹر صاحب! چائے۔“

احسن جو شمیمہ کی فرمائش میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی
آواز پر ہونٹیں میں آیا۔ روزانہ اس وقت اس کی چائے

آتی تھی۔ اسی آواز پر وہ چونکنا تھا۔ اور سر اٹھائے

بغیر کپ مقام لیتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی اس کا دل بے ایمانی

کرتا تھا۔ اور وہ چمکے سے سانوے پیروں پر ایک
نظر ڈال لیتا تھا۔ لیکن اس سے آگے کبھی کوئی بے ایمانی

کرتے کہ اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

”سوہنی۔“ کتنی بار سمجھایا ہے تجھے، پہلے پانی لایا
کر۔“ سلیمہ نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا تھا۔

”نہیں جی۔ بس ٹھیک ہے شکریہ۔“ اس نے مدافعت
کی۔ ”مجھے پیاس نہیں۔“

”نہ جی ماسٹر صاحب! چائے سے پہلے پانی ضرور
پیا کریں۔ گرم چائے معدہ جلاتی ہے جا کر۔“ پہلے پانی

سے ٹھنڈا کر لیا کریں۔“ شمیمہ نے بڑے مدبرانہ انداز
میں اسے سمجھایا۔ ”جاسوہنی پانی لا۔“

وہ بے چارگی سے خاموش ہو گیا۔ اسے بے جا تکلیف

سے بچانے کے لیے ہی اس نے پیاس نہ ہونے کا عذر
پیش کیا تھا۔

”ماسٹر جی! پانی۔“ بڑی مترنم آواز مٹھی اس کی۔

سماعتوں میں نرمیاں سی اتر جاتی تھیں۔

”شکر یہ!“ اس نے حسب معمول نگاہ اٹھائے بغیر

پانی کا گلاس نظام لیا۔

نرم۔ میڈے سے گندھی انگلیاں اس کی انگلیوں

سے ٹکرائیں۔ اسے جھٹکا سا لگا۔ اور بنجانے کیوں نگاہ اٹھا

کر اس نے دیکھا۔ وہ شرمندہ سی کھڑی مٹھی۔

”اب جا۔ پھوٹ۔ کیوں سر پر کھڑی ہے؟“ جلیہ نے

اسے تارا۔

وہ جلدی سے سر کر کرے سے نکل گئی۔

اور پہلی مرتبہ احسن جیلانی نے رات کو اپنے پٹنگ

پر لیٹ کر اس کے بارے میں سوچا۔

”عجیب نوکرانی ہے۔ بھلا کوئی نوکرانیاں بھی ایسی

خوبصورت رکھتا ہے، اسے تو اس جیلی کی رانی ہونا چاہیے

تھا۔ وہ چمکیے بھر کیلے لباس جوان تینوں جیلوں پر

انتہائی نامناسب معلوم ہوتے ہیں۔ وہ پہنٹی تو کیسے

سج جاتے۔ سچ جج بے چارہ ہی۔ ایسی بھلی صورت اور ایسی

کھوئی قسمت۔“

پھر اس نے اس خوبصورت نوکرانی پر اپنا مزید

وقت ضائع کرنے کے بجائے کر دٹ بدل کر سوچا

مناسب سمجھا۔

زندگی اپنی ڈگریوں رواں ہوئی مٹھی کہ وہ خود

حیران رہ گیا تھا۔

”کیا دریا خان سچ کہتا ہے؟“ وہ اکثر سوچتا تھا۔

میں بہت جلد بھول جاؤں گا کہ میرے کیا خواب تھے۔ میں

کیا چاہتا تھا، کون سی بلندیاں میرے تصورات میں

تھیں۔ کیا میں اسی زندگی کو اپنا نصیب جان کر ایسے

سی نباہ دوں گا۔ لیکن کب تک؟ کب تک یہ تینوں

لڑکیاں انگریزی بولنے کے شوق میں مجھ سے پڑھتی

نہیں گی۔ بہت جلد انہیں اپنی شوقیہ پڑھائی سے اکتا ہٹ

ہونے لگے گی۔ اور ایک دن مجھے کہا جائے گا کہ میں

کل سے نہ آؤں۔ پھر کیا کروں گا میں؟ کہاں جاؤں

گا میں۔“

اسے اپنا آپ شدت سے بے کار اور غیر مفید محسوس

ہوتا۔ اس درجے میں ایسی اسے گھیر لیتی۔ کہ وہ سنجیدگی

سے خوشی کے متعلق سوچنے لگتا۔ کئی بار وہ گاؤں کو

دوسرے قریبی گاؤں سے جدا کرتی اس شفاف ندی کے

پاس جا کر بیٹھتا اور اس میں پاؤں لٹکا لیتا۔ اور

سوچا کرتا کہ اس ندی کی گہرائی زیادہ سے زیادہ کیا ہو

گی۔ کیا اس میں ایک چھوٹے کا نوجوان ڈوب سکتا

ہے یا نہیں۔

پھر جب سورج ڈوبنے لگتا اور آسمان کی سرخیاں

ندی کے پانی کو سونے جیسی رنگت بخشتیں تو وہ اٹھتا

اور تھکے ہارے قدموں سے چلتا ہوا دریا خان کے گھر کا

رُخ کرتا۔ دریا خان بھی عجب آدمی تھا، نہ اس نے کبھی

اس کے آئندہ کے ارادوں کے متعلق جاننے کی کوشش

کی، اور نہ جیلوں بہانوں سے اپنے گھر کا حدود دار ربع

جتایا۔ یعنی اپنے متعلق وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ زندگی میں

پیدا ہونے والی ہر تبدیلی کو وہ اس طرح سے قبول کرتا

تھا۔ جیسے یوں ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ ایسے ہی رہے

گا۔ احسن کو اس نے ہمیشہ کشادہ دلی سے اپنے گھر میں

ہمیشہ کے لیے رکھ لیا تھا۔

لیکن احسن جیلانی، دریا خان کے الگ تھا۔ ہر لحاظ

سے الگ، زندگی میں پیش آنے والے نئے واقعات

اسے بے طرح ڈسٹ بکرتے تھے۔ سو ایک عجیب اور نئے

واقعہ نے اسے نہ صرف ڈسٹ بلکہ خوف زدہ بھی کر دیا۔

اس شام نہ سلیمہ مٹھی نہ شمیمہ۔ دونوں اپنی کسی پہلی

کی شادی میں گئی ہوئی تھیں۔ سلیمہ کو اکیلا دیکھ کر اس

کا ہمیشہ آف رہنے والا مود مزید آف ہو گیا۔

”آپ کی شادی کب ہوئی گی؟“ اس نے قدرے اکتاہٹ

سے پوچھا تھا۔

”جی ماسٹر صاحب۔“ وہ مسکرائی۔ ”آپ بیٹھے نار۔“

”آپ کی بہنیں پیچھے رہ جائیں گی۔“

وہ دل سے چاہ رہا تھا کہ وہ بھی چھٹی کرے تو اس

کی جان بخشی ہو جائے۔

”دفع کریں جی۔ ان کم بختوں کا کب دل لگتا ہے

پڑھائی میں۔ میں ہی زبردستی کرتی ہوں ان کے ساتھ۔

میں تو جی آج بھی پڑھوں گی اور کل بھی۔“

”بہتر۔“ وہ بیٹھ گیا۔ کل کا کام پورا ہے آپ کا؟“

”جی۔“ چیکنگ کراؤں؟“

”کرائیے۔“ اس نے لبوں پر آنے والی مسکراہٹ

ہے ان خالی دماغوں میں۔ دو دلوں کی داستان! پھر اسے یکایک زور سے ہنسی آئی۔

غالباً کل بائیس سوں محترمہ نے یہ فلم دیکھی ہوگی اور دنیا انہیں خیال آیا ہوگا کہ انہیں بھی تو ایک ہیرو پڑھانے آنا ہے۔ جسے انہوں نے اپنی زندگی کا ہیرو بنانے کا فیصلہ کر ڈالا۔ سوچتے سوچتے اسے کافی رات بیت گئی۔ اس نے افسانے سے وہ نہ صرف ذہنی طور پر مجروح ہوا تھا بلکہ فیزیو بھی ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی بہت عام سی ہی لیکن بہال ایک لڑکی تھی۔ صنفِ نازک۔ جو اسے خود سے بے زار یا کسی بھی مشکل میں بہت آسانی سے پھنسا سکتی تھی۔ اس کے ذرا سے اشارے پر حویلی کے خوشنوار ملازم اس کی تیکا بولی کر سکتے تھے۔

رات کی فضاؤں میں رچی خنکی کے باوجود اس کا وجود گرم ہونے لگا۔

اور عام تو وہ صرف اپنی شخصیت میں تھی۔ دوسرے پہلو سے دیکھا جاتا تو وہ ایک بڑے زمیندار کی لادلی صاحبزادی تھی۔ احسن جیلانی کو اپنا آپ ان دیکھے پھندوں میں الجھنا نظر آیا۔ اچھے احساس ہوا کہ اب اسے بڑی احتیاط سے کام لینا ہے اسے دوسرے رویے سے کام لینا ہے تاکہ اس لڑکی کو نہ تو دھمکا کرے جانے کا احساس ہو اور نہ ہی وہ کسی خوشی میں مبتلا ہو سکے۔ اسے علم تھا کہ زیادہ سختی سے کام لینے کا نتیجہ قریب الٹ بھی ہو سکتا تھا۔ اس بے شعور لڑکی سے اسے کسی قسم کی اچھی امید نہ تھی۔

”بہر حال، کروٹ لے کر اس نے سوچا۔“ میرا دل بھی صاف ہے اور ضمیر بھی۔ خدا میری مدد کرے گا۔“ پھر اس نے آسمان پر پھیلتی سفید بولوں کو دیکھا اور بکیے میں منہ دبا کر سو گیا۔

اگلے دن اس نے کمال صفائی سے چھٹی ماری اور کہلا بھیجا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب وہ اس لڑکی کو اکیلے میں پڑھانے کا خطرہ مول لینے کو قطعاً تیار نہ تھا۔ کل اظہارِ عشق کیا تھا۔ آج مزید کیا کچھ کہتی؟ اسے خبر نہ تھی۔

اور وہ شاید قبولیت کی کھڑی تھی جب اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ گھڑا تھا۔ شام آنے تک وہ شدید قسم کے بخار میں مبتلا ہو گیا۔

درباخان کی بیوی نے ایک بڑی محبت کرنے والی بہن کی طرح اس کی تیارداری کی، اور دونوں ایک اس کے پاس بیٹھی رہی اس کا سر دباتی رہی اور ہاتھیں پر مٹھتی رہی۔ اس پر دم کھرتی رہی۔

اور احسن جیلانی نے سوچا کہ درباخان کا فیصلہ کتنا درست تھا۔ اگر وہ اس فرشتوں جیسی معصوم اور محبت کرنے والی لڑکی کو محض ان پڑھ اور گناہوں کی لڑکی سمجھ کر چھوڑ دیتا اور اس کی ماموں زاد بہنوں جیسی کسی شہر کی لڑکی سے شادی کر لیتا تو اس کا یہ گھر فردوسِ کدہ کے بجائے جہنم کدہ لگتا۔ ٹھیک ہو جانے کے بعد نہادھو کر اس نے سب سے پہلا کام حویلی جانے کا کیا۔ چاروں کی چھٹی کے بعد اس کے ذہن سے جلیبہ کی باتیں بھی کافی حد تک محو ہو گئی تھیں اور اب اس کی کم عقلی پر اسے ہنسی آرہی تھی۔

حویلی کے مرکزی گیٹ کا کھٹکا کھولا اور صحن عبور کر کے براآمد کے گیٹ جا پہنچا۔ آج ساری حویلی سوئی سوئی خاموش خاموش سی لگ رہی تھی۔ صحنوں کی نرم دھوپ صحن اور آدھے براآمد سے بین بھی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے گول ستونوں پر بلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جن کے سرے پتے چمکے اور خوشنما لگ رہے تھے۔

”ماسٹر صاحب،“ کسی نے انتہائی نرمی سے پکارا تھا۔ وہ چونک کر مڑا۔ سامنے سوہنی کھڑی تھی سرخ اور سیاہ چہرہ کی کا دوپٹہ ماتھے تک اوڑھے، نظریں جھکائے وہ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

”جی۔“ اس نے ایک نگاہ اس کی پلکوں پر ڈالی۔

”کیا بات ہے؟ آج چھٹی کرنی ہے؟“

”جی۔ نہیں۔ وہ۔“ اس نے چاروں جانب دیکھا۔

وہ مسکرا دیا۔

”اطمینان سے بتائیے کیا بات ہے؟“

”آپ۔ آپ۔ اندر چلیں۔“ اس نے پھر بے چینی سے اُدھر اُدھر دیکھا۔

وہ بے حد گھبرائی ہوئی، خوف زدہ سی لگتی تھی۔

”چلیے۔“ اس کی حالت دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

وہ اسے گول کمرے میں لے آئی۔ وہ یوں بھی روز

یہاں آنے کا عادی تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

جب کہ وہ قدرے فاصلے پر کھڑی رہی جیسے اس نے

کوئی بڑا گناہ کیا ہو۔

”جی بی بی۔ کیسے۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کیا پتا ہے کیا حویلی کے لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں؟ اتنی خاموشی کیوں ہے۔“

”جی۔ وہ سب۔ بڑے چچا کی حویلی گئے ہیں پندرہ دنوں کے لیے۔“ اس نے آہستگی سے بتایا۔

”ابھی احساس نہیں ہوتا۔ کہ میں سب سے آخر میں بچا ہوں۔ کھانا کھاتی ہوں۔ اور ان کی بیٹیوں کی سترن پہنتی ہوں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ مجھے اتنا کام کرتا دیکھ کر ہمارے سارے لوگ مجھے نوکرانی سمجھتے ہیں۔“ اس کی آواز رندہ گئی اور وہ خاموش ہو گئی۔

”اچھا! لیکن کیوں؟“

”ان کے چھوٹے بیٹے کی میت ہو گئی ہے۔ اسی لیے سب کو جانک ہی جانا پڑا۔“

”اوہ۔ سچ۔ سچ۔ بہت افسوس ہوا سن کر۔ لیکن آپ یہ سب مجھے باہر ہی بتا دیتیں تو بہتر تھا۔“

”ماسٹر جی۔ آپ۔ آپ۔ اتنے دن مجھے پڑھا دیں گے؟ اس نے انتہائی عاجزانہ درخواست کی تھی۔

”حسن نے چونک کر اسے دیکھا۔

”آپ کو؟“ اس نے انتہائی تعجب سے پوچھا تھا۔

”لیکن کیوں؟“

”کیوں؟ اس لیے کہ میرا بھی پڑھنے کا دل کرتا ہے۔“

”آپ نے اپنے مالکوں سے اجازت لے لی ہے؟ اس نے نرمی سے پوچھا۔“

”مالکوں نے؟“ وہ مدد سے تعجب سے بولی تھی۔

”کون مالک؟“

”میرا مطلب ہے۔ بڑی بیگم صاحبہ۔ وہ گھر بڑا گیا۔“

”ماسٹر جی! میں یہاں نوکرانی نہیں ہوں۔ وہ یکدم اس کا مطلب سمجھ گئی۔ میں۔ میں ان لوگوں کی سگی ماں جانی کی بیٹی ہوں۔ خالہ میں وہ میری۔“

”اوہ۔ کیا واقعی؟ اسے شاک لگا تھا۔ تو پھر۔ میرا مطلب ہے اتنا فرق کیوں ہے، آپ کے رہن سہن اور آپ کی خالہ زاد بہنوں کے رہن سہن میں۔“

”اس لیے کہ شاید جو کچھ مجھے آپ نے سمجھا وہی یہ سب لوگ بھی سمجھتے ہیں۔“ سوہنی نے افسردگی سے سر جھکا لیا۔

”میں خالہ کی اس بہن کی بیٹی ہوں، جو ان کی طرح اتنے بڑے آدمی سے نہیں بیانی گئی تھی، بلکہ ایک چھوٹے، عزیز ڈرامور کی بیوی تھی۔ میری ماں مر گئی تو ابانے دوسری شادی کر لی۔ خالہ مجھے سوئیلی ماں کے ظلم سے بچانے کے لیے تو یہاں لے آئی ہیں۔ لیکن۔ لیکن انہیں اپنے اور اپنی اولاد کے سلوک نظر نہیں آتے، شاید اسی لیے

”ماسٹر صاحب۔ آپ میرا یقین کر لیں جی۔ کسی کو اس بات کا علم نہیں ہو گا۔“ وہ اس کی خاموشی سے مایوس ہو کر بولی۔ ”ان لوگوں کے جاتے ہی سارے ہڈ حرام نوکر اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے ہیں۔ اب ان کے آنے سے ایک دو دن پہلے ہی لوہیں گے۔ صرف چوکیدار اور کھانا پکانے والی ماسی رہ گئے ہیں۔ چوکیدار کو نشتے کی بیماری ہے

”بہت افسوس ہوا مجھے یہ سب جان کر۔ لیکن سوہنی! بات صرف اتنی ہے کہ کوئی نہ تو اپنی صورت خود بنا لے اور نہ مقتدر۔ شاید آپ کو احساس نہیں ہے کہ اس سترن کو پہن کر بھی آپ ان تینوں سے علیحدہ اور منفرد لگتی ہیں۔ نہ وہ اپنی صورت آپ جیسی کر سکتی ہیں اور نہ آپ اپنا مقتدر ان جیسا۔“

اس کا انداز اور اس کا لہجہ بالکل سادہ اور بے ریا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس نے انتہائی مخلصانہ جذبات سے مغلوب ہو کر کہا تھا۔

”میں نے کبھی اپنے خدا سے شکایت بھی نہیں کی۔ اس نے جلدی سے سر ہلایا اور آنکھیں صاف کر لیں۔ سب کو اپنے اپنے حصے کا ملتا ہے، آپ سے تو مجھے تیس اتنا کھنا تھا کہ ان پندرہ بیس دنوں میں آپ مجھے جتنا پڑھا سکتے ہیں پڑھا دیں۔ میں بالکل کوری نہیں ہوں ماسٹر صاحب۔ جو کچھ آپ نے میری بہنوں کو سکھایا ہے۔ وہ سب مجھے آتا ہے۔ میں۔ میں اکثر یہاں پردے کے پیچھے سے وہ سب سیکھتی رہتی ہوں۔ جو آپ انہیں سکھاتے ہیں چپ کر، چوری سے ان کی کاپیاں اور کتابیں بھی پڑھتی ہوں۔ اتنا کچھ تو مجھے بھی آتا ہے۔“

وہ حیرانی سے اس کی صورت کو تک رہا تھا۔ جنہیں پڑھنے لکھنے کا شوق محض فیشن کی حد تک تھا۔ انہیں دو دو ہزار کی ٹیوشن کی سہولیت حاصل تھی اور جس کا یہ شوق جنون کی حدوں تک جا پہنچا تھا۔ اسے پردے کے پیچھے چھپ کر چوری کا علم حاصل کرنا پڑتا تھا۔ وہ بڑی دیر تک کے لیے خاموش ہو گیا۔

”ماسٹر صاحب۔ آپ میرا یقین کر لیں جی۔ کسی کو اس بات کا علم نہیں ہو گا۔“ وہ اس کی خاموشی سے مایوس ہو کر بولی۔ ”ان لوگوں کے جاتے ہی سارے ہڈ حرام نوکر اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے ہیں۔ اب ان کے آنے سے ایک دو دن پہلے ہی لوہیں گے۔ صرف چوکیدار اور کھانا پکانے والی ماسی رہ گئے ہیں۔ چوکیدار کو نشتے کی بیماری ہے

”بہت افسوس ہوا مجھے یہ سب جان کر۔ لیکن سوہنی! بات صرف اتنی ہے کہ کوئی نہ تو اپنی صورت خود بنا لے اور نہ مقتدر۔ شاید آپ کو احساس نہیں ہے کہ اس سترن کو پہن کر بھی آپ ان تینوں سے علیحدہ اور منفرد لگتی ہیں۔ نہ وہ اپنی صورت آپ جیسی کر سکتی ہیں اور نہ آپ اپنا مقتدر ان جیسا۔“

اس کا انداز اور اس کا لہجہ بالکل سادہ اور بے ریا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس نے انتہائی مخلصانہ جذبات سے مغلوب ہو کر کہا تھا۔

”میں نے کبھی اپنے خدا سے شکایت بھی نہیں کی۔ اس نے جلدی سے سر ہلایا اور آنکھیں صاف کر لیں۔ سب کو اپنے اپنے حصے کا ملتا ہے، آپ سے تو مجھے تیس اتنا کھنا تھا کہ ان پندرہ بیس دنوں میں آپ مجھے جتنا پڑھا سکتے ہیں پڑھا دیں۔ میں بالکل کوری نہیں ہوں ماسٹر صاحب۔ جو کچھ آپ نے میری بہنوں کو سکھایا ہے۔ وہ سب مجھے آتا ہے۔ میں۔ میں اکثر یہاں پردے کے پیچھے سے وہ سب سیکھتی رہتی ہوں۔ جو آپ انہیں سکھاتے ہیں چپ کر، چوری سے ان کی کاپیاں اور کتابیں بھی پڑھتی ہوں۔ اتنا کچھ تو مجھے بھی آتا ہے۔“

وہ حیرانی سے اس کی صورت کو تک رہا تھا۔ جنہیں پڑھنے لکھنے کا شوق محض فیشن کی حد تک تھا۔ انہیں دو دو ہزار کی ٹیوشن کی سہولیت حاصل تھی اور جس کا یہ شوق جنون کی حدوں تک جا پہنچا تھا۔ اسے پردے کے پیچھے چھپ کر چوری کا علم حاصل کرنا پڑتا تھا۔ وہ بڑی دیر تک کے لیے خاموش ہو گیا۔

”ماسٹر صاحب۔ آپ میرا یقین کر لیں جی۔ کسی کو اس بات کا علم نہیں ہو گا۔“ وہ اس کی خاموشی سے مایوس ہو کر بولی۔ ”ان لوگوں کے جاتے ہی سارے ہڈ حرام نوکر اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے ہیں۔ اب ان کے آنے سے ایک دو دن پہلے ہی لوہیں گے۔ صرف چوکیدار اور کھانا پکانے والی ماسی رہ گئے ہیں۔ چوکیدار کو نشتے کی بیماری ہے

”بہت افسوس ہوا مجھے یہ سب جان کر۔ لیکن سوہنی! بات صرف اتنی ہے کہ کوئی نہ تو اپنی صورت خود بنا لے اور نہ مقتدر۔ شاید آپ کو احساس نہیں ہے کہ اس سترن کو پہن کر بھی آپ ان تینوں سے علیحدہ اور منفرد لگتی ہیں۔ نہ وہ اپنی صورت آپ جیسی کر سکتی ہیں اور نہ آپ اپنا مقتدر ان جیسا۔“

کم بہت رات کو اتنی کھا لیتا ہے کہ سارا دن اپنی کوٹھری
 پر لیٹا رہتا ہے۔ ماسی بارہ بجے سو جاتا ہے تو
 شاہی کے ایک سونے کی مٹی ہے۔ ایسے میں اگر
 آپ آکر گھنٹہ دو گھنٹہ کے درمیان گئے تو کسی کو کانوں
 کان خبر نہیں ہوگی۔ مجھے پکا چاہے جی۔ میں تو پلی بڑھی
 ہی یہاں ہوں، میں جانتی ہوں ایسے میں کوئی اگر میرا
 خون بھی کر جائے نا تو دس دن سے پہلے تو کسی کو خبر ہی
 نہیں ہوتی ہے۔

حسن نے اسے نور سے دیکھا۔ جوش خطابت میں وہ
 اپنی ہر کمزوری سے اسے آگاہ کر رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر
 کہ ماسٹر صاحب ایک جوان مرد تھا۔ جس کی نیت کسی بھی
 لمحے بے ایمان بھی ہو سکتی تھی۔ جب کہ ایسی کھل آزادی
 ملتی تھی۔

آخر یہ لوگیاں اس قدر اہم کیوں ہوتی ہیں۔ ہر کسی
 کو اپنا چاہا سمجھ لیتی ہیں۔
 رات کو بستر پر لیٹ کر اسے سوچا تھا۔

”کس قدر تفصیل سے حسن نے مجھے ہر بات سے آگاہ کر
 دیا ہے۔ آخر کوئی لگتا ہوں میں اس کا اور کتنا مانتی
 ہے وہ مجھے۔ ہر وقت لڑکی۔“

لیکن کچھ بھی نہ جانے کی ہر بات پر
 نہ معلوم کیوں اسے دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر اس
 کے بچپن کا حسن اس کے اندر سے نکل کر سامنے آکھڑا ہوا
 تھا۔ وہ حسن جسے اپنے ہیکلوں میں، اچھے کالج میں

پڑھنے کا انتہائی شوق تھا۔ جسے کالج میں ٹیوشن کی از حد
 ضرورت تھی، اور وہ دو دو سو سو روپے کی ٹیوشن اور وہیں کر
 سکتا تھا اور اسی لیے اسے کسی پروفیسر نے پڑھانے کی

ہامی نہیں بھری تھی۔ وہ حسن جس کے کالج کے خواب
 لوٹ بھوٹ کر اسی کی آنکھوں میں پیوست ہو چکے تھے، وہ
 کیسے کسی کو پڑھانے سے انکار کر سکتا تھا۔

دوسرے دن وہ جو ملی پہچا اور سو سنی کی حسب ہدا
 سیدھا گول کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ وہیں موجود تھی۔ اپنی
 کافی کھولے اس کی منتظر تھی۔

”ماسٹری۔ آپ آگئے۔“ اسے دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔
 ”ہیں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی میں سمجھی تھی آپ نہیں
 آئیں گے۔ بس مجھے بہلانے کو کل ہامی بھری تھی۔“

”نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ مسکرا کر اس کے

سامنے بیٹھ گیا۔ ”جب میں پیسوں کے لیے یہاں آسکتا
 ہوں تو کسی کا دل رکھنے کے لیے بھی ضرور دے گا۔ دل
 تو دینے کا لگتا میں کہ نہیں سکتا۔“

”آپ بہت اچھے ماسٹر صاحب ہیں۔“
 ہونے سے ہنس کر وہ خاموش ہو گیا۔
 ”لایے دکھائیے۔ کیا کیا کام کر رہا ہے۔“

اس کی کافی نے کروہ اس کا کام چیک کرنے لگا پھر
 اسی دو دن کافی پر نظر میں جاتے اسے مخاطب کیا۔
 ”سو سنی کی بی۔ ایک بات کہوں۔ آپ برا تو نہیں
 مانیں گی بھائی۔“

”آپ کی کسی بات کا میں برا نہیں مانوں گی۔ آپ
 نے توجہ اتنا احسان کیا ہے مجھ پر۔ میرا اتنا بڑا شوق پورا
 کر رہے ہیں۔“

”جس طرح کل آپ نے مجھے اپنی تنہائی اور اکیلے پن
 کا احساس دلایا ہے ایسا کسی اور کے سامنے مت کیجیے گا
 مجھے فرشتہ ہونے کا دکھ تو نہیں ہے لیکن بہت سے لوگوں

میں شیطان بھی چھپا ہوتا ہے۔ انہیں انہیں محض چہروں
 سے نہیں پہچان سکتے اور لڑکیوں کو تو بہت محتاط ہونا
 چاہیے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نامہری اس۔“

”جی۔“ وہ اس کی سے لڑکی۔ لیکن ماسٹر صاحب آپ
 پر تو مجھے پکا اعتماد ہے جی۔!“
 ”وہ کیوں؟“ آنکھیں قدرے بند کرتے ہوئے اس

نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”آپ توجہ سے دیکھیں۔ آپ سے توجہ رشتہ بنتا ہے میرا۔“
 ”وہ فرشتہ ہے۔“

”رشتہ۔؟“ وہ حیرانی کی حدوں کو پار کر گیا۔ ”کون
 سا رشتہ؟“

”وہ جی۔ وہ۔“ حلیمہ آہا میری بہن لگتی ہیں، تو آپ
 ان کے حوالے سے میرے دو لہا بھائی ہوئے نا۔“
 ”ہاں انکیلیوں میں دبائے وہ ساکت رہ گیا۔“

”پھر وہ حواسوں میں لوٹا۔ کافی نبرد کی اور صوفے کی
 پشت سے ٹیک لگالی۔
 ”کس نے کہا یہ سب آپ سے؟“ قدرے درشتی سے

اس نے پوچھا تھا۔
 ”مجھ سے تو کسی نے نہیں کہا۔“ وہ اس کے انداز پر
 گھبرا گئی۔ ”قسم لے لیں۔ حلیمہ آپا نے مجھ سے بالکل نہیں

کہا۔
 ”بھروسہ۔ یہ بے ہودہ کہو اس کیوں فرمائی آپ نے؟ وہ
 انتہائی طور پر تپ چکا تھا۔
 ”وہ۔ وہ تو سلیمہ آپ کو بتا رہی تھیں۔ وہ نزدیکی
 گئی؟ میں۔ میں۔ وہیں لیٹی تھی، انہیں خبر نہیں تھی۔
 بس ایسے سن لیا میں نے۔“

”کیا فرما رہی تھیں وہ؟“ دانت کچکچا کر اس نے پوچھا۔
 ”بگ۔ آپ اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔
 اپنا تو جی پکا پتا تھا انہیں۔ ہاں آپ کا پکا پتا نہیں تھا
 لیکن وہ کہہ رہی تھیں آپ انہیں بڑی سیٹھی نظر سے
 دیکھتے ہیں۔ اور۔ اور انہیں یقین ہے کہ آپ بھی ان
 سے۔ کرتے ہیں۔“

”کیا کرتا ہوں؟“ اس نے بین کا پی پر دے مارا۔
 ”وہ۔“ اس نے محسوس نہ کیا۔ ”وہ۔ جی۔ محبت۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر ہٹا کر لیا اور کافی دیر
 تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ اسے حالات کی گھینٹی کا علم ہوتا
 جا رہا تھا۔ وہ لڑکی حلیہ، اسے کسی بھی مشکل میں پھنسا
 سکتی تھی۔ یہ شہر نہیں ایک جھوٹا سا گاؤں تھا۔ اگر اسے
 یہاں کسی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑ جاتا تو وہ یا خان
 پر بھی یہاں کی زمین تنگ ہو سکتی تھی۔ اور اس کے پیارے
 دوست، اس کے حسن پر کوئی رنج آتی وہ جیتے جی شرمندگی
 سے مر جاتا۔

”کیا ہوا ماسٹر صاحب؟“ سوہنی نے ڈرتے ڈرتے
 پوچھا۔

”حسن نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔“

”سوہنی بی بی! جو کچھ آپ نے اپنی آپا کے منہ سے
 سنا وہ سراسر غلط ہے۔ نہ میں اپنے دل میں ان کے
 لیے کوئی جذبہ رکھتا ہوں اور نہ ان کے کسی جذبے کی
 پذیرائی کے لیے تیار ہوں۔ میں ایک سیدھا سادا سا بندہ
 ہوں، کچھ دنوں کے لیے یہاں آیا ہوں، پھر نجانے کہاں
 ہوں گا مجھے خود خبر نہیں۔ آپ کی آپا میرے لیے کتنی
 مشکلات کھڑی کر سکتی ہیں۔ شاید انہیں اندازہ نہیں
 ہے۔“

”نہیں جی۔ آپا بہت اچھی ہیں۔ وہ حلی سے بولی۔
 ”بس ذرا مزاج کی تیز ہیں۔ تو کیا ہوا، اکثر لڑکیاں
 ہوتی ہیں۔ آپ جی ان کا دل نہ توڑیں۔“

”اوہو۔ کیا بے وقوفی ہے؟“ وہ جھٹکا گیا۔ ”میں جلدی
 ہوں، اور اب شاید سمجھی نہ آؤں۔“
 وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”مم۔ ماسٹر جی۔ بہت نہیں جی۔“ وہ بوکھلا اٹھی۔
 اور اس کا بازو تھام لیا۔
 ”حسن اپنی جگہ رک گیا۔“

”دیکھیے اگر آپ چلے گئے نا تو آپا جو کیدار کو بلا کر پوچھیں
 گی کہ ماسٹر صاحب کیوں نہیں آئے۔ انہیں کتنے دن کی
 چھٹی کا کہا تھا۔ اور جو کیدار انہیں بتا دے گا کہ اسے کچھ
 خبر نہیں۔ وہ تو آپ سے گھر گیا ہی نہیں۔ اور پھر میری
 شامت آئے گی۔ آپا نے مجھ سے ہی کہا تھا کہ میں جو کیدار
 کو پیغام دے کر آپ کے گھر بھیج دوں کہ پندرہ دن کی
 چھٹی کرنی ہے۔ دیکھیے ماسٹر صاحب! ایسے مت جائیں،
 خفا ہو کر، ناراض ہو کر، میں سچ کہتی ہوں مجھے بڑی مار
 پڑتی ہے۔ حالہ مجھے چھڑی سے مارتی ہیں۔“

اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں سے آنسوؤں کی
 جھڑی رواں ہو گئی۔ وہ چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا
 رہا۔ اس کا بازو سمجھتی سے تھامے وہ اس کے قریب کھڑی
 بیٹ بیٹ آنسو گر رہی تھی۔ بڑا خوبصورت منظر تھا اور
 حسن نے اپنی زندگی میں ایسا خوبصورت منظر پہلے کبھی
 نہ دیکھا تھا۔ اپنا بازو جھپٹانے کی کوئی کوشش کیے بنا
 وہ خاموش کھڑا اسے ٹمکتا رہا۔

پھر اچانک اسے خود ہی احساس ہوا اور اس نے
 حلی سے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ پھر دوپٹے کے
 پلو سے آنکھوں کو رگڑ ڈالا۔

”کیا کہہ رہی تھیں تم۔ حالہ تمہیں چھڑی سے مارتی
 ہیں؟“ اس نے ایسے پوچھا جیسے برسوں کی شناسائی
 رہی ہو۔“

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”لیکن کیوں؟“ اسے بے پناہ آنسو ہوا۔

اس پھولوں جیسی لڑکی کو تو کوئی پھولوں کی چھڑی
 سے بھی نہ مارتا۔ کیسی سنگ دل بے حس عورت تھی
 اس کی حالہ۔

”بس جی! اس کی زندگی ہوئی آواز نکلی۔ کوئی
 غلطی ہو جائے تو۔“
 حسن نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔

”آپ ناراض تو نہیں ہیں نا۔“ سوہنی نے اپنی سوہنی صورت اس کی جانب کر کے بڑی آس سے پوچھا۔

”نہیں۔ وہ نرمی سے بولا۔
”اور۔ پڑھانے آئیں گے نا۔“
”کسے؟ تمہیں یا تمہاری آیاؤں کو؟“ وہ مسکرایا۔
”مجھے تو بے شک نہ آئیں پڑھانے۔ کوئی پروا نہیں۔
وہ جلدی سے بولی۔ ”پراہتیں پڑھانے ضرور آنا ماسٹر صاحب، ورنہ میری شامت آجائے گی۔“
”انہیں بھی پڑھانے آؤں گا اور تمہیں بھی۔“ وہ ہنس دیا۔ ”اچھا اب چلتا ہوں۔“

وہ باہر نکلا تو دل کی کیفیت پر حیران تھا۔ ایسی حالت آج سے پہلے تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ لڑکی محض ایک لمحے میں اس کے دل کو اپنا پابند کر گئی تھی۔
”عجب دیدہ دلیری ہے۔“ وہ حیرانی سے ہنس دیا۔

اور پھر وہ روز اسے پڑھانے جانے لگا۔ اسے خود پر بھی حیرت تھی۔ کتنی آسانی سے ہر طرح کا خوف اس کے دل سے نکل گیا تھا۔ بناتے کسی کے دیکھ لینے کا ڈر رہا تھا، نہ تو کمری چلے جانے کا۔ اسے صرف ایک نام، ایک صورت یاد رہ گئی تھی۔ باقی ہر مسئلے کو، ہر پریشانی کو وہ بھولتا چلا جاتا تھا۔ صبح و شام اس کا دل ایک نام لایا تھا۔

”سوہنی، سوہنی، سوہنی۔“
باقی ہر شے کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی۔

”سوہنی۔“
اسے پڑھانے دسواں روز تھا جب اس نے اچانک اسے ریکار لیا۔

”جی ماسٹر جی!“
سارے بال چہرے پر بکھرائے وہ بڑی تندہی سے رائٹنگ کر رہی تھی۔

”کچھ دن بعد تمہارے گھر والے آجائیں گے۔“ اس کے اندر افسردگی اتر آئی۔
”جی۔“ اس کے صبیح چہرے پر ایک تاریک سایہ سالہرایا۔

”بھیر۔ بھیر کیا ہو گا؟“
”بھیر۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور قلم رکھ

دیا۔ ”بھیر ماسٹر جی۔ آپ آئیں گے تو سہی، لیکن مجھے نہیں میری بہنوں کو پڑھانے سے لیے۔ اور میں بھیر پردے کے پیچھے چھپ کر آپ کی آواز سن کر رول گی۔“
”تمہیں افسوس ہو گا۔“

”بالکل ہو گا جی۔“ وہ افسردگی سے بولی۔
”کس بات کا؟“
سوہنی نے ایک نظر اس پر ڈالی، پھر فوراً ہی بھگا لی۔

”بولو نا سوہنی۔ کس بات کا افسوس ہو گا۔“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”افسوس ہو گا کہ میں بس اتنا سا ہی پڑھ پائی۔“ وہ ناخن سے میر کی سطح کھرچنے لگی۔

”بس، بس سوہنی۔ اس ایک بات کا افسوس۔“ وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔

”اور۔“ اور مجھے ان تینوں سے بڑی جلن بڑھند محسوس ہو گا، جو آپ کو دیکھ سکے گی۔ آپ سے ہنس بول سکیں گی۔ اور میں۔“
”حسن نے گہرا سانس لیا۔

”جانتی ہو کسی دوسری لڑکی سے حسد اور جلن کب محسوس ہوتی ہے؟“

”جب کسی سے پیار ہو جاتا ہے۔“ وہ اچانک بولی اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔
”حسن بے ساختہ مسکرا دیا۔

”تو نہیں یہ دعوائے۔“
”اگر ہے بھی تو لا حاصل ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”کیوں بھئی۔“ وہ حیران ہوا۔ ”کیوں لا حاصل ہے۔ تمہاری خالہ نے مجھے خریدنا حقوڑا ہی ہے۔“

اس کے دل میں خوشی کی کلیاں کھل رہی تھیں۔ یہ خیال کس قدر خوش کن تھا کہ جس کے تصور نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں، وہ خود بھی جاگتی تھی اور اسے یاد کرتی تھی۔

نیند آنکھوں سے بہت جس نے اڑا رکھی تھی یہ سو کیا کہ ہوا اس کو بھی سونا مشکل! ”بولو سوہنی۔ کس بات سے ڈرتی ہو؟“

”یہ کون حضرت ہیں۔“

وہ دہلی زبان سے بولی۔

را اوہ - اتنا کہا مانتی ہو میرا - وہ مسکرا دیا۔

وہ لمحہ بڑا حسین تھا جب وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔ بڑی دیر تک خاموش بیٹھے وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔

وہ ایک دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہو گیا۔ حسن
اچانک دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہو گیا۔ حسن
اور سوہنی دونوں ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے تھے، سفید کلفت
کے سوٹ میں آنے والا خود بھی کلفت زدہ لگ رہا تھا۔
سالوئی زندگی پر حکمتی سفید آنکھیں عجیب سرور مہری کا اثر
دے رہی تھیں۔

وہ بڑی دیر تک کھڑا انہیں گھورتا رہا۔
 ”سو سہتی“ پھر وہ غٹرایا ”کون ہے یہ؟ کیا کر رہی
 ہے توہاں؟ باقی سب لوگ کہاں ہیں؟“

”مجھے احسن جیلانی منگنے ہیں۔“ وہ سنبھل کر لولا۔ میں
پڑھانے آتا ہوں ان لڑکیوں کو۔ پچھڑ ہوں ان کا۔“

”نہیں چھوٹے سائین۔ میرے لیے نہیں۔ بڑی بہنوں کے لیے۔“ سوہنی کی حالت غیر تھی۔ ”وہ سب لوگ

”ہوں۔“ وہ سوچ کر لولا۔ ٹھیک ہے ماسٹر! اب تم جھپٹ کر دے سوسنی میں اور یہ کمرے میں ہوں کھانا لے کر

”ہاں میرے رب!“ سوہتی نے دل پکڑا اور صوفی

”سوہنی! کیا ہوا خیریت تو ہے! وہ پریشان
گیا۔

اب کہاں خیریت۔ دیکھا نہیں آپ نے ماسٹر
جھوٹے سائیں تو سب کچھ کہہ دیں گے خالہ سے، بار

میری کم نصیبی سے آپ پیر کوئی مصیبت نہ اچانک

مجبور، کتنا لاچار سمجھتا رہا تھا۔ اپنے مقدر سے شاکمیتا آیا ہوں۔“
 تھا۔ اپنی زندگی کو ناکارہ اور غیر مفید سمجھتا تھا۔ اسے
 احساس ہوا کہ دنیا میں وہ ایک اکیلا ہی اس طرح کا مقدر
 لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کی طرح کے سینکڑوں تھے،
 جو اس کے آس پاس ہی آباد تھے، اور ان میں سے ایک
 سو سنی تھی، جو مرد بھی نہیں تھی، ایک کمزور بے بس لڑکی
 تھی۔

وہ سوچتا رہا اور کڑھتا رہا۔ چھوٹے سائیں کا فطرت
 وجود اور سو سنی کی معصوم صورت اس کی نگاہوں کے
 پردے پر پھلتی سکریتی رہی۔

”گھر پر تو کوئی بھی نہیں ہے۔“

کس درجہ لاچاری سے اس نے کہا تھا۔

”اور میں اسے اکیلا چھوڑ آیا۔ اس چھوٹے سائیں
 کے ساتھ۔“ اس نے مھڑکے سے مٹی اڑائی۔

”لیکن میں کرکھی کیا سکتا تھا۔ کیا گیتا میں اس
 کا، مجھ سے زیادہ تو شاید وہ چھوٹا سائیں اس پر اپنا
 حق جاسکتا ہے۔“

سکانی دیر وہ وہاں کھڑا کڑھتا رہا پھر شکستہ قدموں
 سے گھروٹ آیا۔

”ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر میں ہارتا ہی رہا ہوں۔“

نامراد ہی رہا ہوں۔“ اس نے بکسر پر پیٹ کر سوچا لیکن

اس بار نہیں۔ اگر میں زندگی میں کچھ بھی حاصل نہ کر سکا

تو کیا ہوا۔ سو سنی، میں نہیں نہیں کھوؤں گا، کبھی بھی

نہیں۔“

دوسرے دن وہ بڑے اعتماد سے وہاں پہنچا تھا

چھوٹے سائیں کے آنے کا سب سے پہلا اثر تو یہ ہوا تھا

کہ بڑے گیت پر جو کیدار موجود تھا۔ بغیر کسی نشے کے بڑا

مستعد اور چوکس۔

”سلام ماسٹر صاحب!“

”وعلیکم السلام۔“

”سب لوگ بڑی حویلی گئے ہیں صاحب۔“

”انصار میشن سرویس بڑی کوٹیک ہے آپ کی۔“ وہ

مسکرایا۔

”جی؟ کیا کیا صاحب؟ اس کے خاک پلے نہ پڑا۔“

”ارے بھائی۔ میں ان کو نہیں سو سنی بی بی کو پڑھانے

کر رہا ہوں۔“

”لو فان کا سامنا تو اب ہمیں کرنا ہی ہے، لیکن

آیا ہوں۔“

جو کیدار نے قدرے حیرانی و پریشانی سے اس کی

صورت دیکھی۔ پھر اس کا پر اعتماد انداز دیکھ کر

کھول دیا۔

وہ اندر پہنچ کر برآمدے میں ہی رُک گیا۔ چند لمحوں

میں سو سنی آگئی۔

”آپ۔ آپ آگئے؟“ وہ پریشان ہو گئی۔

”ہوں۔“ اس نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔

اس کی آنکھیں سوچی ہوئی اور۔۔۔ لم تھیں۔

”میرا خیال ہے اب آپ کو نہیں آنا چاہیے۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو، چلو اندر چل کر بیٹھے

بیٹھو۔“

دونوں گول کمرے میں آگئے۔

”چھوٹے سائیں کہاں ہیں؟“ اس نے بیٹھے ہوئے

پوچھا۔

”اوپر۔ اپنے کمرے میں۔“

”تم روٹی ہو؟ کیوں؟“ اس کا دل بے چین ہونے

لگا۔

”ماسٹر صاحب۔“

”ہاں ہوں۔“ اس نے لوگ ویاہ اب تمہارے

سے اپنا نام سننا چاہتا ہوں۔ مجھے اطمینان ہو۔“

”نہیں ماسٹر صاحب!“ اس نے سر نگیں میں ہلایا۔

”اتنی عزت مت دیں مجھے۔“

”ایسا کیوں کہہ رہی ہو سو سنی۔ تم تو ہمیشہ سے قابل

احترام ہو۔“ لائق عزت ہو۔ وہ اس کی باتوں سے پریشان

ہونے لگا۔

”میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ اب آپ کو یہاں نہیں

آنا چاہیے۔“

”دیکھو سو سنی تمہارے چھوٹے سائیں نے خود اپنی

آنکھوں سے ہمیں یہاں بیٹھے دکھا ہے۔ اب یہی سچ

بولنا ہو گا کہ تمہیں پڑھنے کا شوق تھا اس لیے میں باندھنا

سے یہاں آکر تمہیں پڑھاتا رہا ہوں۔ دوسرے معنوں

میں تو مجرم بن جائیں گے کہ اگر تمہارے بیچ صرف

پڑھنے اور پڑھانے کا رشتہ تھا تو چھوٹے سائیں کو دیکھ

کر ہم نے یہ سلسلہ ختم کیوں کر دیا۔ بات سمجھنے کی کوشش

کر دو۔ طوفان کا سامنا تو اب ہمیں کرنا ہی ہے، لیکن

ہمارے کردار پر کوئی کیچڑ نہ اچھلے، یہ زیادہ بہتر ہے۔

”شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ وہ بڑبڑاتی۔

”اور اب یہ بتاؤ کہ تم اتنی برکتیں کیوں ہو، تم روتی کیوں ہو۔ کیا چھوٹے سائیں نے کچھ کہا ہے؟“

وہ حقوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی پھر بولا۔

”چھوٹے سائیں، خالہ سے میرا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔“

”اوہ۔“ وہ ساکت رہ گیا۔

”مبارک ہو۔“ پھر وہ خود پر قابو پا کر پھیکے سے لہجے

میں بولا۔

سوہتی نے ملا متنی انداز میں اسے دیکھا۔

”کس بات کی مبارکباد دے رہے ہیں؟ ایک بچے

سے نکل کر بقیہ زندگی کاٹنے کے لیے دوسرے بچے

میں جانے کی؟“

”وہ بڑے آدمی ہیں۔ نہیں پسند کرتے ہیں۔“

”لے جا رہے ہیں، یقیناً خوش بھی رکھیں گے۔“

”جی سوہ بڑے آدمی ہیں۔ مجھے اب پسند کرتے ہیں۔“

مجھ سے پہلے بھی بہت سی لڑکیوں کو پسند کر چکے ہیں۔

ان میں سے تین کو بیاہ کر لے جا چکے ہیں، اب مجھے لے

کر جائیں گے۔ یقیناً کچھ دن خوش بھی رکھیں گے۔ پھر

میں سول کی اور میرا سیاہ مقدر۔ چھوٹے سائیں کو

ایک مقام پر رکھنے کی عادت نہیں۔“

وہ استہزائیہ منشی تھکی۔

”نہیں۔ نہیں سوہنی۔“ وہ غلط اٹھا۔ ”ایسا نہیں

ہونا چاہیے۔ تم ایسی پیاری لڑکی اس سلوک کی مستحق

نہیں۔ تم کسی کے چند روزہ بہلاوے کا سامان بنو۔ ایسا

نہیں ہو سکتا۔“

”کیا کریں گے آپ؟ وہ بڑے دکھ سے بولی تھی۔

”اگر نہیں۔ میں بیچم صاحب سے تمہارا ہاتھ مانگوں

تو۔؟“

وہ ہولے سے ہنس دی اور خاموش رہی۔

”بولو سوہنی۔“

”مجھ سے ایسا سوال کرتے ہیں جس کا جواب آپ

خود جانتے ہیں۔ خالہ اپنے منہ لو لے بیٹے پر ایک

اجنبی شخص کو کیوں فوقیت دیں گی۔ اور میرا ہاتھ مانگ

کر تو آپ خود بھی قابل شک تمہیں گے اور میں بھی

اور حلیمہ اپنا۔ وہ تو مجھے جان سے مار دیں گی۔“

”لیکن ایسے بھی تو خاموش نہیں رہا جاسکتا۔“ اس

نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

سوہتی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن اسی

لمحے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور چھوٹے سائیں

نے اندر قدم رکھا۔

دونوں خاموش ہو کر کتابوں کی جانب متوجہ ہو

گئے۔ سوہنی کا پی پر آڑی تر تھی لائیں پھینکے گئی۔

چھوٹے سائیں نے چند لمحے اندر کا ماحول دیکھا

پھر آکر کونے میں بیٹھنے صوفے پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے

لگے۔ واضح طور پر وہ ان دونوں کو تنہا دیکھ کر مشکوک

ہوا تھا۔

احسن نے حقوڑی دیر اسے پڑھایا پھر اٹھ کھڑا

ہوا۔

”اچھا سوہنی بی بی! آپ باقی کا کام کر لیجے گا۔

میں کل آکر چیک کر لوں گا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ احسن نے ایک تیز

کڑی نگاہ کونے میں بیٹھے اس اور اس صفت شخص

پر ڈالی اور تیز قدموں سے چلتا ہوا نکل گیا۔

سجائے کیوں اس کا دل ساری دنیا کو تھس نہیں

کر دینے کو چاہ رہا تھا۔ اس کا وجود کتنا حقیر اور

بے معنی تھا، درحقیقت آج اسے اس بات کا۔ جس

پر اٹھا۔ وہ چھوٹے کا لمبا چوڑا انجان کچھ نہیں تھا۔

کچھ بھی نہیں۔ اس قابل بھی نہیں کہ کسی مظلوم بے سہارا

لڑکی کو حالات کے ظالم مگر مجھ کا نوالہ بننے سے بچا سکتا،

اس کا ہاتھ طلب کر سکتا۔ اسے اپنا نام دے سکتا،

بھلا کتنی اہمیت کا حامل تھا اس کا نام۔ غصے کی

شدید لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔

”اتنا غیر اہم، اتنا بے کار، اتنا بے مصرف۔“ اس نے

درخت کے تنے پر مکے برس برس سا کمر اپنا ہاتھ زخمی

کر لیا۔ ”کیوں ہوں میں اس دنیا میں۔ کیا کرنے آیا

ہوں۔“ نقد بر کی ستم طریفیوں پر اس کی آنکھ بھر

آئی۔

پہلے تنہا اپنے دکھ جھپٹا تھا، اپنے زخم ستیا تھا،

تو دروازہ تنہا شدید نہ تھا۔ اب اس درد میں کسی اور

کی آہیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ اور میں۔ میں اپنے

لیے کچھ نہیں کر سکا۔ تو اس کے لیے کیا کروں گا، ایک

بے روزگار، غریب نوجوان کیا دے سکتا ہے ایک لڑکی کو۔ بھوٹے وعدے، کمزور تسلیاں جہنیں وہ اپنے پلو سے باندھ کر اس عیاش امیر کے ساتھ رخصت ہو جائے گی۔ زندگی بھر ملنے اور کڑھنے کے لیے۔ اور ایسے ہیں میرے تصور سے اسے کیسی کراہیت، کتنی نفرت محسوس ہوا کرے گی۔ ہاں ٹھیک ہی تو ہے، ایک مرد جب کسی مظلوم لڑکی کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے تو کون سی خوشی بخش سکتا ہے اس کا تصور!“

لوٹے بھوٹے، مجروح خیالات لیے شکستہ دل سنبھالے وہ بو جھل قدموں سے گھر لوٹا تھا۔

دوسرے دن وہ حوبلی پہنچا تو حلیمہ، سلیمہ اور شمیمہ اس کی منتظر تھیں۔ لیکن کچھ تناؤ زدہ چہروں کے ساتھ۔

”السلام علیکم۔ آگئیں آپ لوگ۔“ اس کا بھجا ہوا دل مزید بچھ گیا۔

سوہنی کو نہ دیکھنے، اس سے نہ ملنے کا تصور کیا جا لیا تھا۔

”جی ماسٹر صاحب۔“ حلیمہ نے لب کشائی کی، اور آپ کو اس ہتیز لڑکی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم نے آپ کو بیڑے دن چھٹی کے لیے بلوایا تھا۔“

”جی۔“ وہ کوچ میں بیٹھ گیا۔

بنجانے سوہنی نے ان لوگوں سے کیا کہا ہوا تھا ایسے ہیں اس کا کوئی بیان سوہنی کے لیے مزید پریشانی کا باعث بن سکتا تھا۔ اور اس کی پھڑکی سے مار پڑنے کا سوچ کر وہ مزید خاموش ہو گیا۔

”رفع کریں ماسٹر صاحب! پریشان نہ ہوں، حلیمہ اسے پریشان دیکھ کر بولی۔“ وہ میسنی ہے ہی ایسی۔ آپ کی منتیں کی تھیں نا، اس نے کہ اسے پریشان کیا کرنا سب بتا دیا ہے اس نے۔ کم بخت کو اتنا خیال نہ آیا کہ لڑکیاں سے پوچھ کر یہ حرکت کرنی۔ خیر آپ دل برانہ کریں۔ آپ کا بھیا کیا قصور، آپ کا تو کام ہی پڑھانا تھا۔“

”اگر۔“ انہیں بھی پڑھنے لکھنے کا اتنا شوق ہے تو آپ لوگ ساتھ بٹھا لیا کریں ان کو بھی۔“ وہ قدرے محتاط لہجے میں بولا۔

”نہ جی۔“ اسے نہیں پڑھانا لکھانا، سلیمہ نے نکتہ سے ناک بھوں چڑھائی۔ ”یہ بن ماں باپ کی لڑکیاں بڑی

جھلتی پرزہ ہوتی ہیں۔ شکل سے معصوم، اندر سے پوری پڑھ جائیں تو اور مصیبت کھڑی کرتی ہیں۔ اور ویسے بھی اماں نے اس کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ ذرا چاہا سائیں کے بیٹے کا چالیسواں ہو جائے تو اماں اس کا نکاح کر دیں گی۔ اچھا دیکھا بھالا لڑکا ہے، اپنے ہی گھر کا ہے۔ اس نے خون کے کئی گھونٹ بھرے۔

”آپ۔ کیسے رہے اتنے دن ماسٹر صاحب، حلیمہ نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس نے تلخ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑا کر ”میرا مطلب ہے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی نا آپ کی۔“

”جی میں ٹھیک ہوں۔ شکریہ۔“ وہ خشک لہجے میں بولا۔ ”اب آپ لوگ کاپیاں کھولیں۔ تو کچھ پڑھائی ہو جائے۔“

انہیں پڑھا کر، مزید کرنے کے لیے کام دے کر وہ سیدھا ہوا تو چائے کا کپ اس کے سامنے آ گیا۔

”ماسٹر صاحب! چائے۔“

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، صورت اُنکھیں سرخ ناک۔ اسے اپنی جانب دیکھتا یا کر اس نے دانتوں سے ”شکریہ“

UrduPhoto.com

آہستگی سے کہہ کر اس نے کپ بٹھا ما اور پھر رک گیا۔ اس کی کلائی پر نیل پڑا ہوا تھا۔ واضح، لمبا اور گہرا نشان۔ اسن جلیانی کے اندر راباں اکٹھے لگے۔ اس کا جی جلا رہا تھا۔ اس کی کلائی سے اور اسے کھینچتا ہوا اس جہنم کے سے باہر لے جائے۔ لیکن ایسا کرنے کا کوئی حق اس کے پاس نہ تھا۔ سو وہ چائے کا کپ تمام کر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ ہاں خود سے بدلہ اس نے اس طرح لیا کہ گرم گرم چائے لمبے لمبے گھونٹ بھر کر اندر اتاری اور جلتے ہوئے دل کو مزید جلا ڈالا۔ بنجانے کیوں وہ کچھ دیر وہاں کھڑی رہی پھر آہستگی سے مڑ گئی۔

وہ انتہائی غصے کے عالم میں بیٹھا رہا، بات بے بات لڑکیوں کو ڈانٹتا رہا۔ پھر بغیر کچھ کہے اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی، اس کی جانب پشت کیے، صحن کے پکے فرش کو گھور رہی تھی۔

”رات آٹھ بجے۔ ندی کے کنارے!“ اس نے سرگوشی

کے سے عالم میں اس کے قریب سے گزرتے اس نے کہا اور آگے بڑھتا گیا۔

اسے کوئی امید نہ تھی کہ وہ آئے گی۔ بچانے اسے کتنی آزادی تھی۔ تھی بھی یا نہیں۔ اسے دیکھ کر تو ایسا لگتا تھا کہ اس کے سانس لینے پر بھی پابندی تھی پھر بھی وہ ہندی کے کنارے بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔

دریا خان سے وہ کہہ آیا تھا کہ رات کو دیر سے لوٹے گا۔ اور دریا خان اس کی قنوطی طبیعت سے واقف تھا سو اس نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔

دس بجے کے قریب ایک ہیولا اندھیرے سے برآمد ہوا اور کسی نے ہولے سے پکارا۔

”ماسٹر صاحب۔“

”ہاں سوہنی۔ میں یہیں ہوں آ جاؤ۔“

وہ بنا آواز کے اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”کیسی ہو سوہنی!“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔ وہ اپنے

آنسوؤں پر قابو پانے پر بالکل قادر نہ تھی۔

”تمہیں مارا ہے ان لوگوں نے؟“

”کوئی اور بات کہہ رہی کیوں بکریا تھا آپ نے۔“

”چھپ کر آئی ہو۔“

وہ ہولے سے ہنس دی۔ اس طنزیہ ہنسی میں اس

کے سوال کا جواب تھا۔

”اور اس وقت نکلتے ہوئے کوئی تمہیں دیکھ لیتا

تو۔؟“

”یہ خیال آپ کو اس وقت آنا چاہیے تھا جب آپ

نے ملنے کے لیے کہا تھا۔“ وہ بولی۔ ”میں نے تو کہا تھا نا کہ

جب کسی کو سب کچھ مانتے ہیں، تو اس کی ہر بات مانتے

ہیں۔“

”سوہنی۔ اور جب کسی کو سب کچھ مانتے ہیں نا تو

اُسے کسی مشکل میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی تکلیفوں

پر دل تڑپ اٹھتا ہے اور سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتا

ہے۔“

”مثلاً۔ کیا کہہ سکتے ہیں آپ میرے لیے۔ وہ ادا سی

سے بولی۔

ہر چند کہ اس نے ایک سادہ سا سوال ہی پوچھا تھا۔

لیکن آسن جیلانی کے لیے یہ ایک بہت بڑا طعنہ تھا۔ جو

خود کو پیلے ہی کم مایہ سمجھتا ہو، اس کی قیمت پوچھی جائے تو وہی حال ہوتا ہے جو احسن جیلانی کا ہوا۔ وہ بیسے

انگاریوں پر لوٹ گیا۔

”سوہنی۔ سوہنی میں شادی کروں گا تم سے۔ اپنا

نام دوں گا، اپنی محبت دوں گا۔ اور تمہیں دینے کے لیے

محبت میرے پاس واحد شے ہے۔ مجھے اس بات کا اتنا ہلکا

دکھ ہے۔“

”مجھے آپ سے محض اسی شے کی آرزو ہے۔ باقی سب

مٹی ہے، فانی ہے۔ لیکن ماسٹر صاحب! یہ ہونا ممکن بھی

تو نہیں۔ کچھ دن بعد تو میرے نکاح کی تاریخ بھی طے

ہو جائے گی۔ ہمارا ملنا تو نا ممکن ہے۔ بچانے میں کیوں

چلی آئی۔“

وہ اٹھی مگر احسن نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام

لیا۔

”نہیں سوہنی! ایسے مت جاؤ۔ ابھی میں بہت سی

باتیں کرنی ہیں۔ بہت سی منصوبہ بندیاں کرنی ہیں۔

بیمیں اپنی زندگی کا لاکھ عمل تیار کرنا ہے۔“

”کون سی زندگی؟“

”جو تم مل کر بسر کریں گے۔ ساتھ ساتھ۔“

”لیکن کس طرح؟“ وہ زرج ہوئی۔

”یہی تو سوچنا ہے۔ تم بیٹھے جاؤ لیمنر۔“

وہ کش مکش کا شکار تھی، مگر بیٹھ گئی۔

”پہلے یہ بتاؤ۔ یہاں اگر دیر ہو گئی تو تم کسی مشکل کا

شکار تو نہیں ہو جاؤ گی۔“

”میں نے جو کیدار کا آپ کو بتایا تھا کہ۔ وہ نشے کا عادی

ہے، مجھے اس کی کوٹھڑی میں جا کر اس کا نشہ تلاش

کرنے میں مشکل نہیں ہوئی۔ وہی پڑ یا اس کے کھانے

میں ملا دی ہے، وہ صبح تک اونگھتا رہے گا۔“

”ہوں۔ اب میری بات غور سے سُنو۔“ وہ بولا۔ ”سوہنی!

میں تمہیں کسی اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا۔“

میں ایک بالکل اکیلا، بے مدد غریب آدمی ہوں، ماں

باپ کب مرے، مجھے خود علم نہیں۔ بچپن سے خود کو اپنے

ماموں کے گھر پایا۔ مامی مزاج کی تیز ہیں۔ انہیں میرا

وہاں رہنا پسند نہ تھا۔ ماموں کے حالات بھی کچھ خاص

نہیں تھے، میں سرکاری اسکولوں میں پڑھ پڑھ کر بڑا ہوا۔

تعلیم غیر معیاری تھی، سوا چھی نوکری بھی نہ مل سکی۔ دریا خان

نے تمہاری خال سے میرا ذکر کیا ہوا تھا۔ اس کے بلانے پر
میں نے ماموں کا گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور یہاں
چلا آیا۔ اب میرا تو آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ نوکری میرے
پاس ہے نہیں۔ یہاں ٹیوشن پڑھا کر جو روپیہ جمع کیا ہے
وہ ضرور میرے پاس ہے۔ لیکن وہ بھی ناکافی ہے ایک
زندگی شروع کرنے کے لیے۔ تم بتاؤ ان حالات میں تم
میرا ساتھ دینا چاہو گی یا نہیں سوچ کر فیصلہ کر لو۔ تم
پر کوئی زبردستی کوئی جبر نہیں۔ سوچنے کے لیے مہلت
درکار ہو تب اس وقت تم واپس جاسکتی ہو۔ باقی بات
کل یا پیرسوں کر لیں گے۔

”مجھے ایک لمحے کی مہلت بھی درکار نہیں۔ میں آپ کا
ساتھ اپنی خوش نصیبی سمجھ کر قبول کروں گی۔ لیکن کس طرح؟“
”گھر چھوڑ کر چلو گی میرے ساتھ؟“
وہ بڑی دیر سے بے خاموش ہو گئی پھر اس کی لپکلی
آواز نکلی۔

”یعنی۔ یعنی۔ بھاگ کر؟“

”ہاں۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولا۔ ”ہمارے پاس دوسرا
کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔ ہم دونوں سرکھی جائیں تو
کم از کم تمہاری ڈیوٹی میرے لیے اس گھر سے نہیں نکلتی۔“
”لیکن ہم کہاں جائیں گے؟ اس کا مدافعتی لہجہ انتہائی
کمزور تھا۔“
”اللہ کی زمین بہت بڑی ہے سوہنی۔ ہم کہیں بھی چلے
جائیں گے۔ جہاں ہمیں کوئی نہیں جانتا ہو گا۔ اپنی زندگی
ہم کسی خوبصورت سی جگہ پر شروع کریں گے؟“

”اور۔ اور۔ اگر پکڑ لیے گئے تو؟“ اس نے تھوک
نگلا۔ وہ بے حد خوف زدہ ہو چکی تھی۔

”ہاں۔ یوں تو قیمت اب تک ایسی رہی ہے کہ
آئندہ بھی کچھ زیادہ خوشگوار نظر نہیں آتی۔ لیکن آزما
لینے میں کیا خرچ ہے؟ کم از کم دلوں میں ملال تو نہ رہے
گا کہ ہم نے کوشش ہی نہیں کی۔ پکڑے گئے تو قبریں
ضرور برابر برابر بنیں گی۔“

وہ ہولے سے ہنسا۔

”ماسٹر صاحب!“

”بولو احسن۔!“

”ابھی نہیں۔ ابھی تو مجھے خود پر بھی عبور دےنا نہیں۔“

اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے۔ تم گھر جاؤ۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اگر
تمہیں منظور ہوا تو ہم پیرسوں اسی وقت یہیں ملیں گے۔
ورنہ میں سمجھ لوں گا کہ ایک مجبور لڑکی اپنے ہاتھوں میں
بندھی زنجیریں اور پیروں میں پڑی بیڑیاں توڑنے
کی ہمت نہ کر سکی۔ اور اس میں اس لڑکی کا کوئی قصور
نہ تھا۔“

وہ اٹھا اور سہارا دے کر اسے بھی اٹھایا۔

”چلو۔ میں تمہیں جوہلی تک چھوڑاؤں۔“

”نہیں ماسٹر جی۔ آپ جائیں۔ میں آتی بھی اکیلی تھی،
واپس بھی اکیلی ہی جاؤں گی۔“ آہستگی سے بازو ٹھٹھا
کر وہ رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

بیچ کے دو دن اس نے کس طرح سے کاٹے وہی
جاسا تھا۔ سوہنی کو چھوٹے سائیں سے بچانے کی دھن
اس کے دماغ میں بری طرح سما چکی تھی۔

تیسری رات وہ آٹھ بجے ہی وہاں چلا آیا۔ سردیاں
اختتام پذیر ہو چکی تھیں اور فضا میں خوشگوار سی حدت
محسوس ہوتی تھی۔

کافی دیر وہ غائب و غامض کی سی کیفیت میں بیٹھا
رہا۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ آئے گی یا نہیں۔ وہ کوئی
قیافہ لگانے سے بھی قاصر تھا۔ اپنی عزت اس طرح
سے داؤ پر لگا دیا کسی بھی لڑکی کے لیے ایک بہت بڑا
قدیم ہو سکتا تھا۔

وہ اکیلا بیٹھا دنیا کے ہر مسئلے پر سوچتا رہا۔ رات
آدھی سے زیادہ بیت گئی جب کوئی آہستگی سے اس
کے برابر آ بیٹھا۔

”ماسٹر صاحب! میں آگئی ہوں۔“ سوہنی کی آواز تھی۔
اس نے ایک گہرا سانس چھوڑا۔

”شکر ہے۔ میں تو مایوس ہو چلا تھا۔“

”مجھے نہیں بتایا ٹھیک کر رہی ہوں یا غلط۔“

”فیصلوں کے صحیح یا غلط ہونے کا انحصار عموماً وقت
پر ہوتا ہے سوہنی۔“ وہ بولا۔ ”ہم صرف اچھی امید رکھ
سکتے ہیں۔ اب میری بات غور سے سنو۔ میں کل یہاں
سے چلا جاؤں گا۔“

”کہاں؟“ وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

”میری پوری بات سن لو پھر پوچھنا۔“ اس نے رسائی

نیت

نے کہا: ”سنوکل میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ نواب شاہ
میں میرا ایک دوست رہتا ہے میں اس کے پاس دو دن
رکوں گا۔ ایسا نہیں اس لیے کرتا ہے تاکہ کسی کو بھی یہ
علم نہ ہو سکے کہ تم کسی کے ساتھ گئی ہو، ورنہ ساری تلاش
آسان ہو جائے گی۔ میں دو دن پہلے چلا جاؤں گا تو کسی
کو یہ خبر نہ ہو سکے گی کہ تم کہاں اور کس کے ساتھ گئی ہو،
مجم دونوں ساتھ گئے ہیں، کوئی سوچ بھی نہ سکے گا۔
”جی۔“

”منگل کے دن تم صبح چار بجے والی گاڑی میں بیٹھو
گی۔ چار بجے اندھیرا ہوتا ہے، تم چوکیدار کو نشہ دے
دینا اور چادر میں لپیٹ کر حویلی سے نکل آنا۔ اسٹیشن
یہاں سے دس منٹ کے راستے پر ہے۔ صبح کے وقت
پلیٹ فارم بالکل سناں ہوتا ہے۔ تم گاڑی میں بیٹھ
جانا بنا کسی خوف کے۔ وہی گاڑی کچھ گھنٹوں بعد نواب شاہ
پہنچے گی۔ میں وہاں سے گاڑی پکڑ لوں گا اور ٹرین میں
تمہیں ڈھونڈ لوں گا۔ ہم کراچی جائیں گے۔ نکاح کریں
شے اور وہیں کسی چھوٹے سے علاقے میں چھپ کر
کچھ عرصہ گزار لیں گے۔“
”لیکن میں وہ خوف زدہ تھی، اگر راستے میں ہم لوگ
نہ مل سکے تو؟ اگر میں کھو گئی تو؟“

”نہیں سوہنی، ایسا نہیں ہوگا۔“ اس نے یقین دلایا
”اس منصوبے میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔“
”اگر آپ گاڑی نہ پکڑ سکے ماسٹر صاحب تو میں
کہاں جاؤں گی؟ مجھے تو نہ زمین پناہ دے گی نہ آسمان۔“
”جی چھوٹا نہ کرو سوہنی! میں ایسا سرگز نہ کرنا محض
دربار خان کا خیال ہے۔ وہ میرا محسن ہے، میں اسے
گاؤں بھر میں ذلیل کر کے نہیں جاسکتا۔ پلیز میری تجویز
کو سمجھو سوہنی۔“
”مجھے ڈر لگتا ہے ماسٹر صاحب۔“

”پھر تم یہاں آئی کیوں کہیں؟“ اسے اچانک غصہ
آگیا۔ ”اب بھی واپس جاسکتی ہو۔“
وہ خود بھی از حد نروس اور خوف زدہ تھا۔ ایسے
میں سوہنی کا خوف اس کے اعصاب کو مزید کمزور کر
رہا تھا لیکن جب اس کے ڈانٹنے پر وہ رونے لگی تو وہ
مستندہ ہو گیا۔

وہ جب مرد ہو کر خوف زدہ تھا تو وہ تو بھر پور
تھی۔ مزید یہ کہ گھر بھی اسے ہی چھوڑنا تھا۔
کا خوف بھی اسے ہی زیادہ محسوس ہونا تھا۔
”آئی ایم سوری۔ سوہنی پلیز، چپ ہو جاؤ۔“ اس
نے ندامت سے اسے پکارا۔ ”دیکھو میں معافی مانگتا
ہوں۔“
وہ خاموش ہو گئی۔

”میں ڈر تو لگتا ہی ہے سوہنی۔ لیکن جب تم نے
زندگی شروع کریں گے تو میں یہ وقت یاد کر کے ہنسی
بھی آئے گی، اور نطف بھی فحس ہوگا۔“
اسے بہلانے کے لیے اس نے موضوع بدل دیا۔ اور
نئی زندگی کا تصور سوہنی کے لیے پہلی بارش کی نرم
پینوار جیسا تھا۔ وہ کھل اٹھی۔
”دونوں صبح کے آثار نمودار ہونے تک باہر کرتے
رہے۔ سینے دیکھتے رہے۔ تصور کی دنیا سجاے سنوارے
رہے۔“

”اچھا سوہنی۔“ پھر اس نے آسمان دیکھا اور کھڑا
ہو گیا۔ ”خدا نے چاہا تو منگل کے دن ملیں گے ہاں!“
”جی ماسٹر جی۔“ اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔ ”خدا آپ
کا نگہبان ہو۔“

حویلی جا کر اس نے یکم صاحب سے ملاقات کی
اور انہیں بتایا کہ وہ حیدر آباد جا رہا ہے، اسے وہاں
نوکری مل گئی ہے۔

”ماسٹر۔ اچانک کیسے؟ وہ پریشان ہو گئیں۔
”جی بس۔ اچانک لیٹر آگیا اس لیے۔“
”لیکن بچیوں کا کوئی تبد و لبست تو کر جاتے۔“
”دیکھیے میرا ایک دوست ہے اسے بھجوں گا، اگر وہ
راضی ہوا تو۔“ اس نے مزید ایک جھوٹ بولا۔
”اچھا۔ تم جیسا تو نہیں پڑھائے گا وہ؟ وہ متذبذب
ہفتیں لڑکیاں خوش ہیں تم سے؟“
”وہ مجھ سے بھی اچھا پڑھائے گا۔ لڑکیاں اس سے
بھی خوش ہوں گی۔“ وہ مسکرایا۔
”اچھا۔ جیسے تمہاری مرضی۔ اپنے دس دن کی تنخواہ
لے جانا۔“

اسے روکنے پر اصرار کرنا انہیں ویسے بھی اپنی توہین

لگا۔

علیہ السلام اور شہید گھر پر نہیں تھیں۔ وہ جان بخشی ہوئے پر خوش خوش چلا آیا۔

دریا خان کو وہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ وہ نواب شاہ جا رہے ہیں۔ سعد حسن کے پاس۔ کچھ دن وہاں رک کر وہ حیدر آباد چلا جائے گا۔

دریا خان عجب آدمی تھا۔ نہ زیادہ سوال کرتا تھا نہ بحث۔ جیسی تمہاری مرضی کہہ کر وہ بھی خاموش ہو گیا۔ اسٹیشن پر اسے چھوڑنے آیا تھا۔

”یار! دل لگتا تھا میرے ساتھ۔“

”ہاں۔ ٹھیک کہتا ہے تو۔ لیکن بس دریا۔ دل بھر گیا تھا ان خالی دماغوں سے ابھرا اچھڑا۔ اب حیدر آباد جا کر کوئی ملازمت دیکھوں گا۔ مل ہی جائے گی۔“

”اپنا اتنا پتا بھیجنا۔“ وہ بولا۔ ”یہ نہیں کہ بالکل بھول بھال کر اپنے دھندوں میں گم ہو جاؤ۔“

”ارے نہیں یار۔ مجھے بھول سکتا ہوں بھلا۔“

”سعد حسن کو میرا سلام کہنا۔“

سعد ان دونوں کا مشترکہ دوست تھا۔

”ہاں۔ ضرور۔“

ٹرین آئی۔ پیر منٹ کے لیے رکی اور وہ اس کے چلنے پر دریا خان سے گلے مل کر لپک کر سوار ہو گیا۔ اسے یقین تھا اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔

سعد اس کا بڑا اچھا دوست تھا۔ بڑی خوش دلی سے ملا۔

”بس بار۔ دو دن تنگ کروں گا تجھے۔ پھر نکل جاؤں گا۔“

”ارے میری جان! تو دوپٹے رہے ہم بابوں کے یار ہیں۔“ وہ ہنسا تھا۔

دو دن اس نے بڑے ہنس بول کر گزارے۔ وہ خود گاؤں سے نکل آیا تھا تو اب اسے سب کچھ بہت آسان لگ رہا تھا۔ بس اسے تو منگل کی صبح پہلی ٹرین پکڑنی تھی۔ اور کراچی جیسے بڑے شہر میں گم ہونا کیا مشکل تھا۔ یوں بھی سوہنی جیسے غیر اہم وجود کی کس کی نظر میں اتنی اہمیت تھی کہ وہ اس کے لیے زیادہ چٹان بن کر رہا۔ ہاں جھوٹے سائیں کو چھٹی بیوی از سر نو ڈھونڈنے میں ذرا وقت پیش آتی۔

پیر کی شام وہ اپنا بیگ درست کر رہا تھا جب سعد کسی کو لیے اندر آیا۔

”لیجئے جناب۔ آپ کے بھی مہمان آگئے۔ یعنی مہمانوں کے مہمان۔“

وہ حیرانی سے مڑا۔ سامنے عبدالرحمن کھڑا تھا۔

”ارے عبدالرحمن! تم! وہ اس سے لپٹ گیا۔“

وہ اس کا جگر کی دوست تھا۔ اور ماموں کے ہاں سے ملتے وقت وہ اسی کو اپنا پتا دے کر آیا تھا۔

”بڑا خواہ کیا ہے تم نے؟ وہ علیحدہ ہو کر شکایتی بولا۔“

”پہلے دریا کے گاؤں پہنچا، وہاں پتا کیا۔ علم موا جناب تو دو دن ہوئے رخصت بھی ہو چکے۔ یہاں اتنی مشکلوں سے سعد کا پتا کیا ہے۔“

”لیکن ایسی کیا افتاد آن پڑی۔“ وہ ہنسا۔

”افتاد! ای جناب میدان مار گئے ہیں آپ۔ سی ایس ایس پاس کر لیا ہے!“

الفاظ تھے کہ سحر چھوڑ کا گیا تھا۔ احسن جیلانی سا کھڑا رہ گیا۔

”کل انٹرویو ہے۔ آج ہر حال میں واپس چلنا ہے۔“

جلدی تیاری کرو۔

”لیکن۔ لیکن۔“ عبدالرحمن۔ ”وہ جیسے کوما میں چلا گیا۔“

”لیکن کیا میرے بھائی۔ خواہوں میں آجا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر ہنسا۔“ ابھی انٹرویو میں پاس ہونا باقی ہے۔ پھر ہم سیلوٹ ماریں گے آپ کو۔ سی ایس ایس آفیسر احسن جیلانی صاحب!“

اسے جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ جیسے وہ سب سن رہا تھا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

”یار احسن۔ تو ٹھیک تو ہے نا۔“

”عبدالرحمن۔ میرے ساتھ آؤ۔“

وہ اسے لے کر قریبی ہوٹل میں چلا آیا اور الف سے بے تک ساری داستان سنا ڈالی۔

”اب بتاؤ۔ کیا کروں؟ مستقبل قربان کر دوں؟“

عبدالرحمن سوچ میں پڑ گیا۔

”معاملہ انتہائی گڑبڑ ہے۔ تم قانون کے محافظ بنے جا رہے ہو اور دوسری جانب ایک بڑا جرم بھی کرنا چاہتے ہو، جانتے ہو لڑکی کو بھگا کر لے جانے کی سزا۔ کون کون

سے مفدمات بن سکتے ہیں تم پر؟ پکڑے گئے تو کہیں کے نہ رہو گے۔ اور ان لڑکیوں کا تو کوئی دین ایمان نہیں ہوتا میرے بھائی عدالت میں جا کر جھٹ بیان بدل دیتی ہیں خود بچ کر صاف نکل جاتی ہیں۔

”یار سبھے صحیح راستہ سمجھاؤ“ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”صحیح راستہ یہ ہے کہ میرے ساتھ چلو۔ پندرہ منٹ بعد ٹرین نے آنا ہے، رات دیر سے کراچی پہنچیں گے اور صبح دس بجے تمہارا انسٹروویس۔ سوچ لو یہ کتنا بڑا چانس ہے لڑکیاں تو ایک چھوڑ سزا ملتی ہیں، یہاں کامیاب ہو گئے تو زندگی کے سارے سنے پورے ہو جائیں گے، عزت، طاقت کیا نہیں ہوگا تمہارے پاس شادی کرنا کسی صوبائی وزیر کی بیٹی سے۔ بارہ لڑکی بھگا کر لے جائے گا؟ یہ اسٹینڈرڈ ہے تیرا؟“

”لیکن۔ لیکن۔ اس کا کیا ہوگا؟ اس کا سانس تیر تیز چلنے لگا۔

”کچھ نہیں“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”نواب شاہ شیش پر تم اسے نہیں چلو گے۔ وہ تمہیں ڈھونڈے گی اور ٹرین میں نہ پا کر اسٹیشن سے ٹرین بدل کر واپس اپنے گاؤں چلی جائے گی۔ ایک بار پھر مارا کھائے گی، اور چھوٹے سائیں کی بیوی بن کر عیش کرے گی۔ دیکھو حسن! میں نے ہر لوائنٹ کلیر کر دیا ہے۔ اب تم جو فیصلہ کرو، تمہاری مرضی۔ لیکن دراجلد کھڑی نکلنے میں دس پندرہ منٹ ہیں۔ میں اسٹیشن جا رہا ہوں، تمہارا انتظار نہیں کروں گا۔“

اس کے جانے کے بعد وہ سانس روکے بیٹھا رہا اور اگرچہ ٹھیک کتا تھا۔ زندگی میں ملنے والا یہ پہلا اور شاید آخری چانس تھا۔ یہ وہ سندر پریمی تھی جسے چھوٹے کے لیے وہ ساری عمر ترپٹا رہا تھا۔ اس کے سینوں کی تعبیریں کہ آج وہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور احسن جبیلانی اندر سے مگر زور بڑھاتا جا رہا تھا۔

اسے سو سنی کا نام، اس کا چہرہ اچھوتا جا رہا تھا۔ بنگلہ، گٹاری۔ باورچی۔ باوردی گاڑا اس کی آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔

”شادی کرنا کسی صوبائی وزیر کی بیٹی سے۔ بارہ لڑکی بھگا کر لے جائے گا۔ یہ اسٹینڈرڈ ہے تیرا؟“

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

ٹرین چلنے سے دو منٹ پہلے وہ اپنا گپ لیے اسٹیشن پر پہنچ چکا تھا۔

اے ایس پی بن کر وہ پنجاب آ گیا تھا۔ اور اس کی زندگی کی ندی اس طرح رواں ہوئی تھی کہ کھلی پانی کے پتھر کہیں اندر ہی اندر بیٹھتے چلے گئے تھے۔ اسے صرف آگے بڑھتے چلے جانا یاد رہ گیا تھا۔

سات سال بعد وہ ایس پی احسن جبیلانی تھا۔ درجہ اس کی بیوی بن چکی تھی۔ اور وہ دو بچوں کا باپ تھا۔ معاشرے میں اس کا نام تھا۔ مقام تھا۔ اور اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو اس نے زندگی سے چاہا تھا۔ زندگی سے، اپنے مقصد سے اسے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ احسن جبیلانی جو بے کار تھا غیر اہم تھا۔ بے نام، بے مقام تھا۔

یادوں کی دھندلی دھندلی دھندلی ہو چکا تھا۔ اور اب تو کچھ وہ تھا اسے خود پر فخر تھا۔ وہ ایک حسین مہکتی رات تھی، ایک بڑے زمیندار کے بیٹے کی شادی کا جشن تھا۔ بڑے بڑے لوگ مدعو تھے۔ شراب کا دور کھلے عام چل رہا تھا۔ جام سے جام گرا رہے تھے۔ آتش بازی اور فائر ورک سے کان پری می آواز دھماکی نہ دیتی تھی جو سینی کا شور اٹک چھا ہوا تھا۔ سامنے بنے اسٹیج پر رقص ہو رہا تھا۔ احسن جبیلانی اپنے کسی دوست سے محو گفتگو تھا، تھکنے بکھر رہے تھے، جب کسی نے بڑی آہستگی سے شراب سے بھرا جام اس کے آگے کر دیا۔

”ڈرنک لیجیے ایس پی صاحب۔“

اس نے چونک کر نگاہ اٹھائی اور پھر اس کی نگاہ ساکت ہو گئی۔ وہ بدلی ضرور تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ پہچان نہ پاتا۔ پست بھڑکیلا لباس زیب تن کیے چہرے کو شوخ رنگوں سے سجائے وہ جس انداز میں کھڑی تھی۔ وہ صاف بناتا تھا کہ اس کا تعلق کس جگہ سے ہے۔

”شکر یہ“ مچھروہ حواسوں میں لوٹا۔ ”میں شراب نہیں پیتا۔“

”اوہ۔ اس نے ہونٹ سکڑے، ”واقعی؟“

پھر وہ زور سے سانس دی اور سنستی سی چلی گئی۔ پھر ہنستے ہنستے وہاں سے ہٹ کر لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔

”جانتے ہو اسے؟۔ اس کے دوست نے اسے ٹھوکا

دیا۔
”نہیں، معلوم نہیں اس کے لبوں سے نکلا بھی تھا یا نہیں۔“

”مشہور حوالہ ہے۔ سوہنی۔ بڑا نام ہے بار۔ سنا ہے بڑی تکجی ہے، تمہیں کیسے جانتی ہے؟۔“
”معلوم نہیں!“ وہ خشک لہجے میں بولا۔

پھر وہ اٹھا اور اٹھ کر ایک قدرے پیر سکون کوٹے میں جا بیٹھا۔ فضا خوشگوار تھی، لیکن اس کا سارا وجود پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ سوہنی تھی! وہی سوہنی جسے میں ان دیکھی، ادھر بنی راموں کا مسافر بنا کر کہیں رستے میں ہی سوتا چھوڑ آیا تھا۔ وہ سوہنی جو معصوم تھی، ان چھوٹی تھی جو چھوٹے سائیں کے گھر چلے آنے سے پریشان ہو جاتی تھی۔ اسے اب تک کتنے چھوٹے سائیں سے واسطہ پڑا ہو گا! لذت کے سمندر میں اس کا پورا وجود غرق ہو گیا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اٹیج پر تھی، بنجانے کیوں اس پر ہنسی کا دورہ پڑا، ہوا تھا۔ وہ ہنستی ہی چلی جا رہی تھی۔ احسن جیلانی نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا، کہنے میں جاتی سیڑھیاں فی الوقت اس کی واحد راہ قرار تھیں، وہ تیز تیز پھلانگتا اور یہ چھت پر چلا آیا۔

وہ باتیں، وہ یادیں جنہیں اپنی دانت میں وہ قطعا بھول چکا تھا۔ اب سر جانب سے اس پر حملہ آور تھیں، ”اگر تم راستے میں نہ مل سکتے تو۔ اگر میں کھو گئی تو؟“

وہ معصوم، خوف زدہ لہجہ۔

”مجھے ڈر لگتا ہے ماسٹر صاحب! وہ اندیشے۔“

آہ! سوہنی۔ تم، تم کہاں نکل گئیں۔ تم لوٹ کر گھر کیوں نہیں گئیں۔ اوہ میرے خدا۔ آگہی کا یہ عذاب اب کیوں نازل ہوا مجھ پر۔ اب ساری زندگی کراہوں گا۔

یہ کیسا بوجھ آن پڑا ہے مجھ پر۔ ریلنگ تھامے وہ ہانپتا رہا۔

”کیوں ابیں پی صاحب! منہ چھپا کر یہاں چلے آئے،

ہم کیا کہہ رہے تھے بھلا آپ کو؟ ہاں؟۔“

اس کے پیچھے وہ نشے میں دھند کھڑی تھی۔

”سوہنی!“

”اوہ۔ نام یاد ہے آپ کو؟“ وہ ہنسی۔ دیریں گڈا

یا داشت تو بڑی اچھی ہے آپ کی۔ بھلا کون سا شیٹ

”سوہنی۔ تم۔ یہ تم کس رستے پر چل دیں!“ وہ آہٹائی

دکھ کے عالم میں تھا۔

”اب پوچھتے ہو مجھ سے۔“ وہ اچانک چلائی۔ ”اب

پوچھتے ہو؟“ اب جب میں نیلام ہو گئی، ایک چکی۔ میری

عزت، میری معصومیت خاک میں مل چکی۔ تو اب مجھ سے

کیا پوچھتے ہو۔ جاؤ ایس بی صاحب جا کر آئینہ دیکھو۔

تمہارے چہرے کی سیاہیوں میں تمہارے ہر سوال کا جواب

ہے۔“

”سوہنی۔ بخدا میں نے ایسا نہیں چاہا تھا۔“ وہ گڑ گڑایا۔

”میں نے بھی ایسا نہیں چاہا تھا،“ وہ بڑے دکھ

سے بولی۔ ”میں نے بھی ہمیشہ دعا کی تھی، کہ میں کبھی تمہیں

نہ دیکھوں، دعا کی تھی میں نے کہ تم زندہ نہ بچے ہو۔ تم اپنا

وعدہ نبھانے سے پہلے کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہو۔“

ابن الشاء کے سفر ناموں کے

سلسلے کا نیا سفر نامہ

نگری نگری پھر مسافر

ابن الشاء کے سفر ناموں کے سلسلے کا آخری سفر نامہ

ہے جو جولائی ۱۹۸۹ء میں پہلی بار چھپ کر تیار

ہوا ہے اس سفر نامہ میں جاپان، روس اور لندن

کے سفر کا احوال درج ہے۔

یہ کتاب خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہو گئی ہے

اور مشہور کارٹونسٹ نجی نے کارٹون بنائے ہیں

قیمت ۵۰ روپے

اس پتے پر خط لکھیں یا قریبی بکسٹال سے خریدیں

لاہور ایڈمز ۳۰۵ سرکل روڈ، لاہور

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، ۲، اردو بازار راجی،

دعا کی ہستی میں نے کہ زندگی کے کسی موڑ پر مجھے یہ علم نہ ہوا کہ مجھے دھوکا دیا گیا۔ میں نے بہت دعا کی تھی، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

لیکن۔ ہم سیاہ نصیب کیا۔ اور ہماری دعا میں کیا تم زندہ ہو۔ اور میں تمہاری قریب کاروں کی عبرت ناک نشانی ہوں۔

سوہنی! مجھے معاف کر دو۔ دیکھو میں اب بھی اپنانے کو تیار ہوں نہیں۔ میں شادی کر سکتا ہوں تم سے۔ دنیا سے چھٹا کر سکتا ہوں۔

”محقق اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے نفرت سے محضوک دیا۔

”چھپ کر طوائف بننے سے کھلے عام طوائف کہلانا مجھے زیادہ منظور ہے۔ تم سے کہیں بہتر تو چھوٹے سائیں تھے۔ تمہاری دوسری بیوی بننے سے ان کی چوٹی بیوی بننا کہیں اچھا تھا۔

”میں مجرم ہوں تمہارا۔ جو چاہو سزا سنا دو۔“

”ہا۔ سزا۔ وہ دور سے ہنسی۔“ ارے ایسی پی صاحب اتنے بڑے آدمی ہیں آپ ہم کی طرح لقمے لوگ کیا سزا سٹائیں گے آپ کو۔ دنیا آپ کی کامیابیاں آپ کی، عدالتیں آپ کی، اوصاف آپ کی، عادات آپ کی، خدارہ جاتا ہے، اور درحقیقت وہی اصل سہارا ہے۔

اور۔ اور سزا سٹھیں اس دنیا میں ملے؟ نہیں نہیں، ایسی پی صاحب سرگرم نہیں۔ میں نے اگر زندگی میں کبھی کوئی اچھا عمل کیا ہو تو اس کی جڑیں خدا سے صرف ایک ہی مانگوں گی، یوم شکر کے دن تمہارا گریبان۔ یہاں اس دنیا میں، میں تم سے اپنی معصومیت اپنی سادگی، اپنی عزت سناخوں بہا طلب نہیں کروں گی ایسی پی احسن جیلانی صاحبہ۔ اور نہ ہی اسے معاف کروں گی۔

میں اسے وصول کروں گی، لیکن یہاں نہیں بلکہ اس جگہ جہاں ایک دن ہر ظالم اپنے مظلوم کے روبرو جوابدہ ہوگا۔

”سوہنی! اتنی بڑی بد دعا۔ وہ گھر گرا یا۔“ میرے دل سے پوچھو اس نے درو کی شدت سے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ ”کیسا درد اٹھتا ہے اس میں۔ تمہیں دیکھ کر، تمہیں زندہ پا کر، تمہیں

بے غیبتی سے جیتا دیکھ کر۔ ایک حسین دنیا کا خواب دکھا کر کس جہنم میں پہنچا یا ہے تم نے مجھے۔ کیا لگاؤ تھا میں نے تمہارا ایسی پی صاحب۔ میں سمجھتی تھی تم نے مجھ کو چاہا تھا مجھے۔ میں سمجھتی رہی۔ تم زندہ ہوئے تو دنیا میں کسی جگہ بھی ہوئے، اپنا وعدہ الٹا کر سنے ضرور پہنچتے۔ میں سمجھتی رہی۔ تم جان سے گزر گئے تو میں بے آبرو ہوئی۔ لیکن تم۔ تم تو زندہ ہو۔ تم تو زندہ ہو۔“

وہ تکرار کرنی آگے بڑھی، رینگ سے جھکی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھا وہ ایک جھٹکے سے نیچے جا گری۔

”سوہنی۔“ وہ بڑے زور سے چلا یا تھا۔

صبح کی سفیدی سارے۔ میں پھیل چکی تھی اور سفید دھواں سا ان کے اندر بھی بھر رہا تھا۔ ”احسن! پورے نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”آپ سوئے نہیں تھے؟“

وہ آہستگی سے اٹھنے لگی۔

”دلوں کی سیاہیوں کے عذاب اکثر ملکوں پر آ کر گھسے ہیں وہ۔“

”چلیے۔ درو پر سو جائیں۔ وہ نمیدیں اس کی بات قطعاً نہ سمجھیں۔

”نہیں۔ میں جا کنگ کرنے نکلوں گا۔“

وہ شانے پر رکھا درو کا ہاتھ نرمی سے ہٹا کر باہر نکل گئے۔

صبح ہر طرف پھیل رہی تھی، اور احسن جیلانی پاگلوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔

